فرد

شمارہ نمبر ۱۳ مئی ۲۰۱۷ء

انڈویجوئل لینڈ

انفرادی آزادی کے لئے کوشاں

پاکستان کے ۷۰ سال

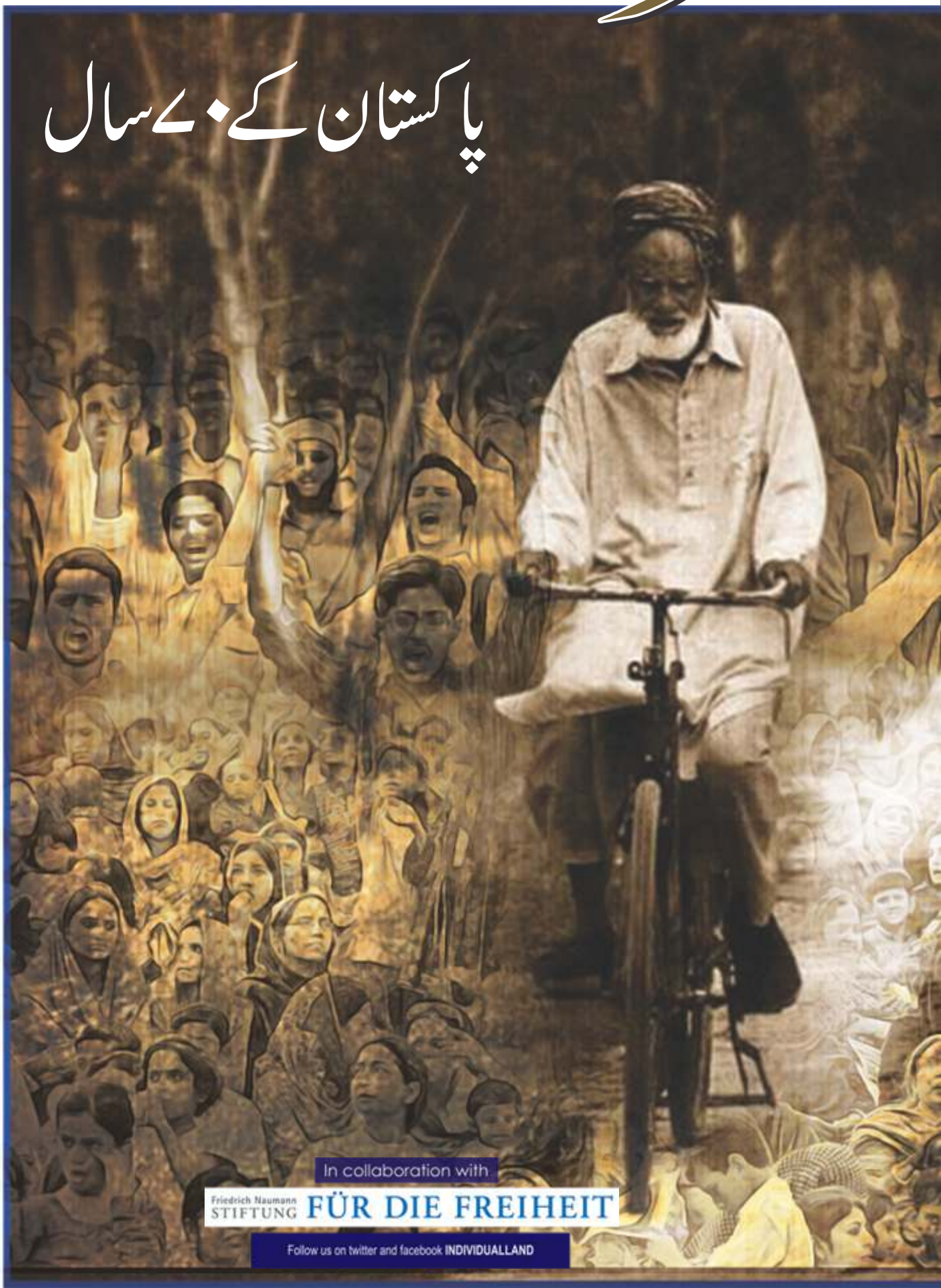

In collaboration with

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT

Follow us on twitter and facebook INDIVIDUALLAND

فرد

شمارہ نمبر ۱۳ مئی ۲۰۱۷ء

فہرست

اڈیٹر کی میز سے	۱
کیا پاکستان واقعی ایک زرعی ملک ہے؟	۲
شکوہ ظلمت شب سے کہیں بہتر تھا	۴
غیر مستحکم علاقہ	۷
کرپٹ کون؟	۱۱
اِسے جمہوریت کہیں، یہ ضروری تو نہیں	۱۴
ہندو میرج ایکٹ	۱۷
ہمارا قومی کھیل کتاب تک محدود کیوں؟	۲۲
میری کاوش رنگ لائے گی	۲۵
ہم ترقی کی جانب گامزن ہیں	۲۸
اقلیتی برادری کے ساتھ بیتے لمحات	۳۱
انفارمیشن کمیشن کو درپیش مسائل	۳۴

ایڈیٹر:
سندس سیدہ

کوارڈینیشن:
سید فہد الحسن

ڈیزائین
عدیل امجد، ڈاٹ لائنز

پبلشر:
انڈویجوئل لینڈ پاکستان

آئی ایس بی این ۹۷۸ ۹۶۹ ۹۵۸۲ ۴۳ ۱

Individualland
Creating space for the individual
مکان نمبر ۲۸۹، السٹونیا ایونیو، سفاری ولاز فیز ۳، بحریہ ٹاؤن اسلام آباد

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

یہ میگزین فریڈرک نومین فاؤنڈیشن فار فریڈم کے تعاون سے تشکیل دیا گیا ہے۔ اس میگزین کا مواد اور مندرجات صرف اور صرف پروڈیوسر / مصنفین کے خیالات اور نتائج کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایڈیٹر کی میز سے

تنقید برائے تنقید ایک معاشرتی بیماری ہے جو غلط کی تردید اور صحیح کی توصیف کرنے سے عاری ہے جسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر کوئی بغیر سوچے سمجھے رائے زنی میں مشغول پایا جاتا ہے: حکومت کام نہیں کر رہی، غیر سرکاری تنظیمیں یہودی ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں، معاشرے کے افراد اپنا کردار ادا نہیں کر رہے۔ اگر کوئی بھی اپنا کام نہیں کر رہا اور دوسروں کا کام کر رہا ہے تو یہ توطے ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی نا کوئی کام تو ہو رہا ہے۔ بجائے اسکے کہ جو کام کر رہے ہیں وہ بھی کام کرنا چھوڑ دیں۔ ہمارا مسئلہ ہے کہ تنقید کرنا ہمارا سب سے بہترین مشغلہ بن چکا ہے، چاہے کسی شخص کی ذات، حکومت، سیاسی جماعت، سول سوسائٹی پر ہو یا کسی بھی کام پر بس ہمیں ایک ہی کام میں مہارت حاصل ہے اور وہ ہے بلا وجہ تنقید کرنا۔ اختلاف رائے رکھنا یا تنقید کرنا بالکل بھی غلط بات نہیں ہے لیکن اگر آپکے پاس حل موجود نہیں ہے تو کم سے کم جو کام اور جتنا کام ہو رہا ہے اس کو سراہنے کا حوصلہ اور ہمت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ تنقید برداشت کرنے کے لیے حوصلہ چاہئے لیکن میرے خیال میں کسی کام کو سراہنے کے لیے اس سے بھی زیادہ حوصلہ چاہئے۔ حکومت کوئی کام نہیں کر رہی یہ میری رائے ہو سکتی ہے۔ لیکن کیا اسکا حل میرے پاس موجود ہے؟ اسکے دو جواب ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ نہیں! میرے پاس کوئی حل نہیں ہے اور نہ ہی میرا یہ کام ہے کہ میں حل پیش کروں، یہ حکومت کا کام ہے حکومت خود کرے۔ دوسرا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہاں! حل موجود ہے لیکن اسکو عملی جامہ کون پہنائے گا؟ ہم تو جو کر سکتے تھے کر دیا۔ صرف حکومت کے بارے میں ہی نہیں بلکہ غیر سرکاری تنظیموں کے بارے میں بار بار کہا جاتا ہے کہ بیرونی ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں۔ ایجنڈے یعنی مقاصد کے بغیر تو کوئی بھی کام نہیں کرتا وہ بیرونی ہو یا اندرونی اگر غیر سرکاری تنظیمیں بھی کام نہ کریں تو کام کون کرے گا؟ البتہ مقاصد یا ایجنڈا ملک کے مفاد میں ہونا ضروری ہے۔ تنقید کرنے والوں کے خیال میں حکومت تو پہلے ہی کام نہیں کر رہی، نہ ہی ہم ذمہ دار شہری کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ پھر بھی بے شمار اچھے کام کہیں نا کہیں کسی نا کسی صورت میں خود ہی ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بلا شبہ جیسے آپ ہر چیز ٹھیک نہیں کر سکتے جیسے کوئی ادارہ ہر چیز ٹھیک نہیں کر سکتا اسی طرح کوئی بھی سرکاری محکمہ ہر چیز لمحوں میں ٹھیک نہیں کر سکتا۔ اپنے حوصلے اور ہمت بلند رکھیں تا کہ اچھے کاموں کو آپ اور ہم مل کر آگے بڑھا سکیں اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر ملک کی تصویر بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ ملک کے لیے کام کرنے کے جذبے لیے نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کر سکیں۔

جو اچھا کام ہو رہا ہے جہاں ہو رہا ہے اس پر بھی توجہ دینے، سراہنے اور اسکو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے بجائے اسکے کہ ہم اس بحث میں الجھے رہیں کہ فلاں کتاب میں چوتھے صفحے پر " کا " کے بجائے " کی " لکھا جانا تھا۔ یہ بھول جائیں کہ اس سبق یا صفحے میں جو پیغام دیا جا رہا ہے وہ کیا ہے؟ اس پیغام کو مزید بہتر کس طریقے سے بنایا جا سکتا ہے؟ جو پڑھایا جا رہا ہے اسکی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو پھر کس چیز کی ضرورت ہے اور کیوں؟ ان ہی خیالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پاکستان کے ۷۰ سالوں میں کیا کھویا کیا پایا کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ خیالات لکھے گئے ہیں کہ کس طرح سے ہم بہتری کی جانب رواں دواں ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

تمام مضامین لکھاریوں کی ذاتی رائے پر مبنی ہیں، اختلاف رائے کا حق آپکے پاس ہے اسکا استعمال کیجئے لیکن یاد رکھیں دوسروں کی رائے کا احترام ہمارا فرض ہے۔ اگلے شمارے تک کے لیے اجازت دیجئے!

سندس سیدہ

کیا پاکستان واقعی ایک زرعی ملک ہے؟

تحریر: ذوالفقار حیدر

پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ یہاں کُل رقبے کے ۳۹.۵ فیصد حصے پر مختلف فصلیں، سبزیاں اور پھل کاشت کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف جانوروں کو پال کر دودھ، گوشت اور دیگر مصنوعات پیدا کی جاتی ہیں۔ زراعت سے حاصل کردہ زرِمبادلہ مجموعی ملکی پیداوار کا ۲۱ فیصد بنتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خوراک اور زراعت کے مطابق گندم، کپاس، گنا، آم، کھجور، کنو اور مالٹوں کی پیداوار کے لحاظ سے پاکستان دنیا کے پہلے دس ممالک میں شامل ہوتا ہے۔ دودھ کی پیداوار کے لحاظ سے پاکستان حال ہی میں تیسرے نمبر پر آ گیا ہے جبکہ حلال گوشت خصوصاً مٹن کی پیداوار کے لحاظ سے بھی پاکستان دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل کرتا جا رہا ہے۔

اب یہ تو سب اچھی اچھی باتیں ہوگئیں۔ یقیناً یہ سب جان کر ہمیں خوشی ہوئی کہ ہمارا ملک زراعت کے اعتبار سے دنیا میں کچھ مقام ضرور رکھتا ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ پاکستان اس مقام کو کیسے برقرار رکھتا ہے یا بہتر بنا سکتا ہے؟ خصوصاً جب ہم اپنے ملک میں پیدا ہونے والی مختلف فصلوں کی پیداوار کا موازنہ دوسرے ممالک سے کریں تو معلوم ہوتا ہے پاکستان اس لحاظ سے کافی پیچھے ہے۔ پاکستان میں پیدا ہونے والی فصلوں کی فی ایکڑ پیداوار دوسرے ممالک میں پیدا ہونے والی فصلوں سے کافی کم ہے باوجود اس کے کہ یہاں کی آب وہوا اور دیگر قدرتی وسائل مختلف فصلوں کی پیداوار کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ یقیناً ہم تحقیق کے ذریعے اپنی فصلوں کی پیداوار کو بڑھا سکتے ہیں اور دنیا کے بہترین ممالک کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں، مگر ہمیں ایسے کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یقیناً وہ تمام سرکاری ادارے جن کا کام زرعی پیداوار کے اضافے کے لئے تحقیق کرنا ہے وہاں بیٹھے افراد یہی کچھ سوچ رہے ہیں کہ کیا ضرورت ہے! تبھی ہم اپنا بنا بنایا مقام بھی کھوتے جا رہے ہیں۔

اب آپ چاول ہی کی مثال لے لیجیے پاکستانی کرنل باسمتی چاول پوری دنیا میں پاکستان کی پہچان تھا۔ یہاں کا چاول اپنے منفرد ذائقے اور خوشبو کے لحاظ سے پوری دنیا میں اپنی مثال آپ تھا مگر پچھلے چند سالوں میں عالمی سطح پر چاول کی قیمتوں میں کمی اور دوسرے ممالک خصوصاً بھارت سے درآمد ہونے والے چاول کے معیار میں بہتری کی وجہ سے آہستہ آہستہ پاکستانی چاول کی درآمدات میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے۔ بھارت کا عالمی سطح پر پاکستان کی جگہ لینے کی ایک بڑی وجہ تحقیق کے ذریعے چاول کے معیار میں بہتری ہے۔ مگر افسوس کے ملک میں چاول کی بہتری کے لئے قائم کردہ ادارے خواب غفلت سے بیدار ہونے کو تیار ہی نہیں۔

اسی طرح پاکستان دودھ کی پیداوار کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آ چکا ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں پاکستان نے پچھلے چند سالوں میں مسلسل ترقی کی ہے اور اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ حکومت اس شعبے کی بہتری کیلئے کام کرتی دکھائی دیتی ہے، خصوصاً پنجاب کے مختلف علاقوں میں کسانوں کو اس سلسلے میں بہت سی سہولیات فراہم کی جا رہی ہیں۔ مگر اس شعبے کا موازنہ دنیا کے دیگر ممالک سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی جانوروں کی نسلوں کی بہتری کیلئے کوئی خاطر خواہ کام نہیں کیا گیا۔ اس کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پاکستان میں دودھ دینے والے جانور کی اوسط پیداوار سات سے آٹھ کلو روزانہ ہے جبکہ عالمی سطح پر ایک جانور کی اوسط پیداوار پچیس سے تیس کلو کے درمیان ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں پیدا ہونے والے دودھ کا محض چار سے پانچ فیصد مکمل عمل سے گزارا جاتا ہے اور باقی کا دودھ نامناسب حالات میں لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے جس سے صحت کے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اسی طرح پاکستان میں پیدا ہونے والے بہت سے پھل جیسا کہ آم، آڑو اور مالٹا، کنو وغیرہ عالمی سطح پر بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ بات پوری قوم کیلئے قابل فخر ہے مگر پھر وہی خدشہ رہتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہم ان پھلوں کے معیار کو بہتر بنانے میں ناکام ہو جائیں اور چاول کی طرح کوئی اور ملک ہماری جگہ نا لے لے۔

یہ ضروری ہے کہ پاکستان ایگریکلچر ریسرچ کاؤنسل (پی اے آر سی) اور نیشنل ایگریکلچر ریسرچ سنٹر (این اے آر سی) اور دیگر قومی اور صوبائی ادارے خواب غفلت سے جاگیں اور ملک میں زراعت کی ترقی کیلئے کچھ کریں ورنہ سی ڈی اے کے این اے آر سی کی جگہ پر رہائشی کالونی بنانے کے فیصلے پر کسی کو افسوس نہیں ہوگا۔ یقیناً کسی باہر کے ملک میں جب کوئی پاکستانی آم یا باسمتی چاول کی تعریف کرتا ہے تو اپنا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ ہمیں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں ہم سے یہ سوال نا پوچھیں کیا ہم واقعی ایک زرعی ملک ہیں؟

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں:
info@individualland.com

شکوہ ظلمت شب سے کہیں بہتر تھا!

تحریر: مشہود علی

میرے نزدیک کرہ ارض پر بسنے والی نسل آدم کی صرف دو ہی اقسام ہیں ایک وہ جو معاشرے کے بگاڑ کو خود کی نا اہلی سمجھتے ہیں اور اس میں تبدیلی کا باعث بن کر تاریخ رقم کر جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس بگاڑ سے سمجھوتہ کر کے اس کو اپنی تقدیر مانتے ہیں کے یہ چیز ہماری قسمت میں لکھ دی گئے ہے۔ تاریخ شاید ان لوگوں کا حوالہ کبھی نہیں دیتی جنھوں نے تاریخ کو کچھ نہ دیا۔ ہمیشہ ان ہی لوگوں کی مثالیں دی گئیں جو ملک وملت کے لیے کچھ کر گئے۔

ہم ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے ہیں جو ابھی تک ترقی پذیر ممالک کی دوڑ میں لنگڑاتا ہوا چل رہا ہے کیونکہ ایک کام ہے جو ہم پچھلے ۷۰ برس سے ایمانداری سے کرتے آرہے ہیں وہ ہے شکوہ۔ ہم سب سیاسی تجزیہ نگار بہت اچھے ہیں ملکی سیاست پر بات کرنے کے لیے ہم پاکستانیوں کو کسی سیاسیات کی ڈگری کی ضرورت نہیں ہم چائے کا کپ ہاتھ میں لیئے ہوٹل میں پنکھے یا ائیر کنڈیشنر والی ٹیبل پر بیٹھ جاتے ہیں اور جتنی جدید گالیاں جانتے ہیں سیاستدانوں کی نذر کر دیتے ہیں۔ گلی کے چوک پر بیٹھ کر مذہبی انتہا پسندی پر خوب بحث کر سکتے ہیں۔ تعلیم کے فرسودہ نظام پر تعلیم یافتہ لوگ بڑی خوبصورت دلیلوں کی روشنی میں اس علم کی شمع کو بجھنے پر نوحہ کناں ہوتے ہیں، منشور نہیں پڑھتے البتہ، رنگ نسل، مذہب، زبان کی بنیاد پر ہم اپنی اور اپنی ملک کی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہیں خود ہی نمائندگان کا انتخاب کرتے پھر خود ہی ان کو کوستے، لیکن ان سب کے باوجود ہم شاید دنیا کی وہ واحد قوم ہیں جو جان کر جیتی نہیں البتہ جان کر مرتی ضرور ہیں۔ کیونکہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی ہم انجان بن کر اپنی زندگی گزارتے ہیں اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہم میں ہر دوسرا شخص مسئلہ بتا سکتا ہے لیکن حل بہت کم ہی بتایا جاتا ہے۔

دنیا کی تمام اقوام وقتاً فوقتاً مسائل سے دوچار رہی ہیں لیکن ان تمام قوموں نے وقت کے ساتھ چلنا سیکھا ہے ہمارے نزدیک ترقی یافتہ ممالکوں کی کئی مثالیں ہیں چائنہ اور جاپان جیسی اقوام جن مسائل سے گزری وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ممالک نے اس مشکل دور میں ایک دوسرے پر الزام تراشی کی یا درپیش مسائل سے نمٹنے کے لیے نئی اور جدید حکمت عملی اپناتے ہوئے ان مسائل کو حل کیا؟ آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اپنی تحریر کے ذریعے ایسے کسی سوال کا جواب آپکے سامنے پیش کروں گا لیکن میری یہ تحریر آپکے کسی سوال کا جواب نہیں بلکہ خود آپکے ذہنوں میں کئی سوال چھوڑنے والی ہے۔

ایک مثال آپکے سامنے پیش کرنا چاہوں گا جو کہ میری آنکھوں دیکھی ہے۔ پاکستان میں صوبہ سندھ کے سب سے بڑے شہر کراچی کی ایک بڑی اور اہم شاہراہ، شاہراہِ فیصل ہے۔ اس پہ موجود ٹریفک کا ہجوم اور اس سے اُٹھنے والا گرد وغبار، تمام گاڑیوں میں موجود مسافروں کو بہت پریشان کر رہا تھا۔ اتنے میں ہم سب لوگ حکومت پر الزام لگاتے ہوئے کہنے لگے کہ کوئی طریقہ کار نہیں ہے، کوئی قانون نہیں ہے جو اس معاشرے کو ٹھیک کر سکے، ہمارے ملک کو مزید بہتر بنا سکے۔ ہم سب شکوے کر رہے تھے اور حکومت کی نا اہلی پر تمہید باندھ رہے تھے کہ اتنے میں میں نے دیکھا کے ایک شخص اس ٹریفک کی رکاوٹ کو ختم کرنے کی نیت سے اُٹھا اور آگے بڑھنے لگا۔ وہ ٹریفک میں رکاوٹ کو ختم کرنے کی کوششوں میں لگا رہا تھا۔ وہ آدھے سے ایک گھنٹے تک دھوپ میں سڑتے ہوئے ہر ایک گاڑی نکلوانے کی کوشش میں لگا رہا۔ بظاہر وہ وہاں موجود ہر ایک شخص کی نظر میں بیوقوف تھا، لیکن میں اس منظر کو دیکھتا رہا اور میرے اردگرد موجود ہر شخص مجھے محض ایک سوال لگ رہا تھا۔ وہ سوالیہ نشان لگ رہا تھا معاشرے پر، وہ مجھے سوال لگ رہا تھا اس ملک کی سلامتی پر، وہ مجھے سوال لگ رہا تھا ہر ایک اعتبار سے۔ ہم سوال کرنے والوں میں سے تھے۔ سوالوں کے اس ڈھیر میں وہ ایک شخص جو امید تھا، وہ ایک اکیلا شخص اس بھیڑ کی ذمہ داری لیتے ہوئے میرے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ ہی چیز میرے ذہن میں گردش کرتی رہی اور میں مستقل سوچتا رہا۔ اگر دنیا کا ہر ایک شخص سوال کرنے والا ہوتا اور وہ معاشرے کو کچھ دینے کے بجائے خود معاشرے پر بوجھ بن جاتا اس کا وجود بھی اس سے ناخوش ہوتا تو کیا آج نسل آدم کا وجود بھی رہتا؟ اگر اندھیرے کی غلامی کرتے رہتے تو کیا بلب بنتا؟ واقعی اگر ہر شخص سوال ہوتا تو کیا معاشرے کے مسائل کبھی حل ہوتے۔ اگر تھومس ایڈیسن اندھیرے کی شکایت ہی کرتا رہتا تو کیا آج ہم روشنی سے آشنا ہوتے؟ اگر گراہم بیل دوری کا شکوہ ہی کرتا رہتا تو کیا کبھی ٹیلیفون بنا پاتا؟ اندھیرے میں جب جب دیپ جلائے گئے ان سے اندھیرا کبھی ختم نہیں ہوا بلکہ اندھیرے میں کمی ضرور آجاتی ہے یہ تمام محض چھوٹے چھوٹے سوال تھے۔ اور اب آپ خود سے پوچھیں، کیا آپ معاشرے کے لیے سوال ہیں یہ جواب؟ اگر آپ خود واقعی ان تمام مسائل کا حل ہیں تو ٹھیک ورنہ دنیا کبھی بھی برے لوگوں کی برائی کی وجہ سے بری نہیں بلکہ اچھے لوگوں کی خاموشی کی وجہ سے بری کہلاتی ہے۔ تو اپنے آرام دہ کمروں سے نکل کر ذرا اک قدم اٹھائیں اپنے بچوں کی سلامتی و بہتری کے لیئے ہمارا پہلا قدم کسی اور کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے ہی ہے اپنی اولاد کے بہتر سے

بہترین مستقبل کے لیے ہی ہے، کیونکہ وہ جو گھر کے دالان میں پروان چڑھ رہا ہے اسکے کے لیے آسانیاں پیدا کریں اس کے مستقبل روشن اور تابناک بنائیں، اور یہ ایک جملہ ذہن میں بٹھالیں کہ بدلاؤ صرف مجھ سے ممکن ہے۔لیکن ساتھ ساتھ اس چیز کو بھی ذہن نشین کرلیں کہ ہم ٹھیلے پر ملنے والے ہار سے لیکر کارتک ٹیکس دیتے ہیں، تو پھر ہمارے ادارے کیا کررہے؟

چلیں آج ایک اور حقیقت سے روشناس ہوتے ہیں، محکمہ پولیس یقیناً یہ نام سن کر آپ کے ذہن میں کسی رشوت خور، بلاوجہ سڑک پر روک کر پریشان کرنے والے کا تصور آیا ہوگا۔یا پھر آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جو کام اس نوجوان نے کیا جو کہ ٹریفک کنٹرول کررہا تھا وہ کام تو اس پولیس والے کا تھا اور وہ یہ کام کیوں نہیں کررہا تھا جبکہ ہم اسکو اس کام کے لیے پیسے دیتے ہیں اور محکمہ پولیس ان کی باقاعدہ تربیت کرتا ہے ایک غیر تربیت یافتہ انسان اگر ٹریفک کنٹرول کرسکتا ہے تو ایک پولیس والا کیوں نہیں کرسکتا؟

دراصل عام شہریوں کے ذہن میں انکا یہی خاکہ تشکیل پاچکا ہے لیکن پس منظر کچھ یوں ہے کہ یہ اعداد وشمار پاکستان انسٹیٹیوٹ آف لجسلیٹو ڈیولپمنٹ اینڈ ٹرانسپرنسی (پلڈاٹ) پاکستانی ادارہ قانون سازی ترقی وخوشحالی، کی ایک تحقیق کے مطابق ہیں، پنجاب میں ۱۵۰۷ افراد کے لیے ایک پولیس اہلکار، سندھ میں ۵۲۴ شہریوں کے لیے ایک پولیس اہلکار، خیبر پختونخواہ میں یہ تعداد ۴۱۴، اسی طرح بلوچستان میں ۳۴۶ جبکہ اسلام آباد میں ۱۹ لوگوں پر ایک پولیس اہلکار تعینات ہے۔پنجاب بھر میں پولیس کی تعداد ایک لاکھ ۸۰ ہزار، سندھ میں ایک لاکھ پانچ ہزار، خیبر پختونخواہ میں پولیس کی تعداد ۶۵ ہزار، اسی طرح بلوچستان میں پولیس ملازمین کی تعداد ۳۸ ہزار جبکہ وفاق میں پولیس ملازمین کی تعداد دو لاکھ آبادی کے لیے گیارہ ہزار ہے، جب کہ عالمی طور پر ۱۰۰۰۰۰ افراد پر ۳۰۰ اہلکار تعینات کرنے چاہیے، اس حساب سے صرف وفاق میں پولیس کی تعداد زیادہ ہے، اور اس تعداد کا ایک بڑا حصہ ہمارے ہی منتخب نمائیدگان اور ان کے بچوں کی حفاظت کے لیے مختص ہوتا ہے، ڈان نیوز کی ایک رپورٹ کے مطابق ۶۰ فیصد پولیس کا عملہ ہمارے منتخب وزیروں، مشیروں، ان کے بچوں، ان کی اہلیا، کی حفاظت میں چاک وچوبند چوکنا رہتے ہیں، اور میں اور آپ محلے میں ہونی والی چوری کی اطلاع دینے کے بعد بھی، راہ تکتے رہتے ہیں اور یہی راگ الاپتے رہتے ہیں کے آخر بھلا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں، ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اب تو پاکستان ۷۰ سال کا ہونیوالا ہے! کیا سوچا ہے یونہی رات کی تاریکی میں راگ ہی گنگنا ہے؟ یا پھر آنے والی نسل کے لیے اپنے اپنے حصے کی شمع جلانی ہے؟؟

مصنف انڈیویجول لینڈ پاکستان مین پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں:
info@individualland.com

غیر مستحکم علاقہ!

تحریر: حور کاکڑ

آخرکار پاکستان کے مغربی محاذ کے حوالے سے خوشخبری! کیا ایسا ہی ہے؟ دہشت گردی کے خلاف دس سال طویل جنگ کے بعد کی داستان؛ حکومت نے فاٹا کو خیبر پختونخواہ کے ساتھ ضم کردینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ پاکستان کے وجود کے ان ۷۰ سالوں میں یہ تجویز پہلی بار نہیں پیش کی گئی ہے۔ جب ۱۹۷۰ میں 'ون یونٹ' کو تحلیل کیا گیا اس وقت فاٹا کو صوبہ سرحد کے ساتھ ضم کرنے کا موقع تھا مگر ایسا کچھ نا ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۷۶ میں بھٹو نے یہ تجویز پیش کی تو ۱۹۷۷ کے فوجی بغاوت کے باعث دوبارہ سے فاٹا کے مستقبل کا فیصلہ نہ ہوسکا۔ ۲۰۰۶ میں مشرف کے دور میں فاٹا میں اصلاحات لانے کے لئے کمیٹی بنائی گئی جس میں فاٹا کو خیبر پختونخواہ میں ضم کرنے کی تجویز موجود تھی۔ لیکن یہ اصلاحات افغانستان میں ہونے والے جنگ کے باعث تاخیر کا شکار ہوگئیں۔ اس کے بعد ۲۰۱۷ء میں اب فاٹا کے مستقبل کا فیصلہ منظور ہونے لگا ہے۔ ۷۰ سال بعد بھی اس عمل میں کچھ کمزوریاں موجود ہیں جن کی بناء پر اس کے مخالف ان اصلاحات کی نفاذ پر سوال اٹھا رہے ہیں۔ ان کی دلیل کسی حد تک درست اس لئے ہے کہ اس انضمام کو نافذ کرنے کے تجویز کردہ مقصد سے یہ کچھ واضح نہیں کہ اس سے فائدہ قبائلی عوام کو ہوگا یا اس کے پیچھے سیاسی مفادات چھپے ہیں۔ فاٹا کا مسئلہ ایک آئینی اور قومی مسئلہ ہے، اس کو سیاسی جماعتوں نے کافی عرصہ سے نظر انداز کر رکھا تھا۔ عام انتخابات قریب ہیں اور فاٹا میں سیاسی جماعتوں کا اختیار کمزور؛ اس لحاظ سے اس علاقہ کو مرکزی دھارے میں لانا سیاسی مفاد ہوسکتا ہے۔ اس سیاسی توجہ کا باعث جو بھی ہو، 'فاٹا اصلاحات' کی نوعیت واضح نہ ہونے کے باعث ہی ان پر سوال اٹھائے جارہے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات کو واضح جواز کے ساتھ بیان نہ کیا جائے تو ان اصلاحات پر جن مثبت نتائج کو پیش کر کے عمل درآمد کیا جارہا ہے ان کی ساکھ پر بھی سوال اٹھایا جاسکتا ہے۔

فاٹا پاکستان کا وہ پیگانہ خطہ ہے جو، بقول سینیٹر فرحت اللہ بابر: "امن اور جنگ کی تاریخ میں بندوق کی حکمرانی پر چلا ہے"۔ اس علاقے میں بہت زیادہ اصلاحات کی ضرورت ہے۔ بجا طور پر تو ان مجوزہ اصلاحات پر لوگوں نے ملے جلے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ خیبر پختونخواہ کی جانب سے فاٹا اصلاحات کو دی جانے والی تجویز کو وفاقی حکومت نے منظور کرلیا ہے۔ اب اس پر فاٹا میں حکومتی اور انتظامی اصلاحات لانے کے لیے عمل شروع کر دیا گیا ہے۔ اس پر یہ سوالیہ نشان بھی بنتا ہے کہ کیا ان اصلاحات کو نافذ کرنے میں فاٹا کے عوام کی رائے کو شامل کیا گیا ہے یا نہیں؟ موجودہ فاٹا اصلاحات کو نافذ کرنے کے لئے وفاقی حکومت نے نومبر ۲۰۱۵ میں چھ ممبران پر مبنی کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ سرتاج عزیز ہیں اور باقی ممبران میں گورنر خیبر پختونخواہ ظفر اقبال جھگڑا، وزیر قانون زاہد حامد، قومی سلامتی کے مشیر ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل ناصر خان جنجوعہ، سیفران کے وزیر ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل عبدالقادر بلوچ اور سیفران کے سیکرٹری محمد شہزاد ارباب شامل ہیں۔ جناح کے ۱۹۴۸ میں قبائلیوں سے کئے گئے معائدے کے مطابق فاٹا کی عوام کا یہ آئینی حق ہے کہ ان کی رضامندی کے بغیر فاٹا کے مستقبل کا کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ اس قانونی حق کو مدنظر رکھتے ہوئے چند قبائلی لیڈران نے ان اصلاحات کے خلاف درخواست جاری کرتے ہوئے اس کمیٹی اور اصلاحات کو غیر قانونی اور غیر آئینی قرار دیا ہے۔ کچھ سیاسی لیڈران بھی اس الحاق کے خلاف ہیں۔ کیونکہ مسئلہ فاٹا کو حل کرنے کے لئے جو اصلاحی کمیٹی بنائی گئی اس کے چھ ممبران میں سے ایک بھی فاٹا کا نمائندہ نہیں ہے۔ پہلے تو فاٹا اصلاحات کمیٹی کو وفاقی نہیں بلکہ صوبائی اسمبلی کے اختیار میں ہونا چاہئے تاکہ یہ پارلیمانی بحث کا حصہ بن سکے۔ دوسرا یہ کہ اس سلسلہ میں تمام متعلقہ اہلکاروں کی شمولیت قابل اعتراض ہے۔

فاٹا اصلاحات کمیٹی کے مطابق ان اصلاحات کو تمام متعلقہ اہلکاروں سے صلاح مشورے کے بعد پیش کیا گیا ہے اور ان کے رپورٹ کے مطابق، قبائلیوں کی اکثریت اس بات سے متفق ہے کہ فاٹا کے خطے کے الحاق خیبر پختونخواہ کے ساتھ کر دینا چاہئے۔ پہلے تو اس کمیٹی کا صنفی اشاریہ جات اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان اصلاحات میں خواتین کی رائے کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ فاٹا کی سول سوسائٹی کو ان اصلاحات کے نفاذ کے حوالے سے واقفیت کے سلسلے میں شامل نہیں کیا گیا۔ ایک اور سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اس طریقہ کار میں فاٹا کے نوجوانوں کو شامل کیا گیا تھا یا نہیں؟ سول سوسائٹی، خواتین اور نوجوان اس عمل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، تو پھر ان کی رائے پر غور و فکر کیوں نہیں کیا گیا؟ اگلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان تجاویز کی پیشکش میں فاٹا کے نمائندوں کو کیوں نہیں شامل کیا گیا؟

جمہوریت عوام کی آواز ہوتی ہے۔ فاٹا کے عوام کی مشاورت کیے بغیر اس عمل کو کیسے جمہوری مانا جاسکتا ہے؟ ان اصلاحات کے پورے سلسلہ میں عوام کی رائے کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ کیوں؟ سینیٹر فرحت اللہ بابر اس انضمام کا خلاصہ کچھ ایسے پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ "یہ انضمام لوگوں کی نہیں بلکہ صرف زمین کو ضم کرنے کے ریفارمز لگ رہے ہیں"۔ یعنی حکومت نے لوگوں کا مستقبل نہیں بلکہ زمین کا مستقبل طے کرلیا ہے۔ فاٹا کو سیاسی یا حکمت عملی کے مسئلے کے طور پر نہیں بلکہ ایک انسانی مسئلے کے تناظر سے دیکھنا

چاہئے۔اس مسئلے کا جائزہ ان اصلاحات کے سلسلہ میں شامل نہیں کیا گیا جو کہ انسانی وسائل کے تناظر سے ضروری ہے۔دیگر محققین اس بات کا دعوہ کرتے ہیں کہ فاٹا کی اکثریت اس الحاق کے حق میں ہیں اور وہ اسکا کھل کر استقبال کرتے ہیں۔فاٹا ریسرچ سنٹر کی فروری ۲۰۱۷ء میں جاری کردہ رپورٹ کے مطابق فاٹا کی ۷۴ فیصد عوام اس انضمام کے حق میں ہیں؛ ۵۴ فیصد مکمل طور پر اس انضمام کی حمایت کررہے ہیں اور ۲۰ فیصد جزوی طور پر اس کی حمایت کررہے ہیں۔لہٰذا، اس انضمام کو بظاہر ایک جمہوری طریقہ سے عمل میں لایا جارہا ہے۔

اس انضمام کے مخالف ان سرویز کے طریقہ کار کی شفافیت پر سوال اٹھاتے ہیں، کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ یہ سروے فاٹا میں ہی منعقد کیے گئے ہیں یا نہیں؟ تاہم ان اعداد وشمار کی تصدیق کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔سابق سینیٹر حمید اللہ جان آفریدی ان سرویز کو چیلنج کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ان سرویز کی شفافیت میں شک ہے کہ ان کو قبائلی علاقوں میں منعقد نہیں کیا گیا ہے۔ہم فاٹا کے نمائندے ہونے کے تحت ان محقق اداروں کیلئے قبائلی علاقوں میں سروے کے انعقاد کرنے کی سہولت فراہم کرسکتے ہیں۔کم ازکم ان کے اعداد وشمار قبائلی لوگوں کی آواز کو اجاگر کریں گے"۔ یہ ان اصلاحات کا سب سے بڑا عیب معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی آواز کو اس میں شفافیت سے شامل نہیں کیا گیا۔ان اصلاحات کے حامی سیاسی جماعتوں کی یہ سب ے بڑی کمزوری ہے کہ لوگوں کا نمائندہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے لوگوں کی رائے پر غور نہیں کیا۔بقول حمید اللہ آفریدی "اس کمیٹی کے نمائندوں نے قبائلی علاقوں میں ۳۰۰ لوگوں کے ساتھ ایک ایک گھنٹے کا سیشن کروایا جس میں اس انضمام کے حامی اور مخالف، دونوں شامل تھے۔یہ سیشنز کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔کمیشن کے مطابق انہوں نے ۳۰۰۰ لوگوں سے مشاورت کی ہے۔ان کے رپورٹس میں دیے گئے اعداد وشمار قبائلی علاقوں کے ملک اور دیگر عوامی لیڈران کے ساتھ کیے گئے سروے، مشاورت سیشنز اور فوکس گروپ ڈسکشنز پر مشتمل ہیں۔اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ حقیقی اعداد وشمار ہیں، تو کیا یہ بات جواز بناتی ہے کہ فاٹا کے ۴۸ لاکھ کی عوام کا مستقبل صرف ۳۰۰۰ لوگوں کی رائے پر مشتمل ہو؟'۔اگر اس سلسلہ میں فاٹا کے معروف نمائندگان کو شامل کیا ہوتا تو ان سوالات کی ضرورت نہیں پیش ہوتی۔ ان سرویز کے متبادل ریفرینڈم بہتر چارہ ہے۔ایک اور راستہ یہ بھی ہے کہ قبائلی علاقے میں ایک فورم منتخب کیا جائے۔فورم کا ہر رکن لوگوں کو ریفارمز کا منشور پیش کرتے ہوئے اصلاحات کی ضرورت اور ان کو سرانجام کرنے کی وضاحت کرے۔تاکہ فاٹا کے مستقبل کا فیصلہ فاٹا سے ہی منتخب لوگ کریں۔لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی آواز سنی جائے جو کہ نہیں سنی جارہی۔ریفرینڈم کا انعقاد کرکے اس انضمام کے حامیوں اور مخالفوں کی حقیقی اعداد وشمار جاننے اور اکثریت کی رائے پر عمل درآمد کرنا چاہئے۔

اس انضمام کے انتظامی اصلاحات کو انجام دینے والے طریقہ کار بھی واضح نہیں ہیں۔کیا خیبر پختونخواہ کی انتظامیہ فاٹا پر خرچ کرے گی؟ اس کے علاوہ، کیا یہ اصلاحات فاٹا میں تعلیم، صحت اور روزگار وغیرہ کی سہولیات کی رسائی میں کمی یا اضافہ کریں گی؟ لیڈی ریڈنگ اور خیبر ٹیچنگ ہسپتال جیسے ہسپتال خیبر پختونخواہ کے ۲۳ اضلاع میں کسی ایک میں بھی نہیں ہیں۔چترال اور ڈیرہ اسماعیل خان سے علیل مریضوں کو علاج کے لئے پشاور لایا جاتا ہے۔اگر خیبر پختونخواہ فاٹا کو اس انضمام کے طور پر ترقی کی پیشکش کررہا ہے تو وہ صوبہ خود ہر ضلعے میں ترقی کیوں نہیں کرچکا؟ فاٹا اصلاحات کمیٹی کی رپورٹ اس بات کو قبول کرتی ہے کہ فاٹا کو مختص فنڈ بدعنوان بیوروکریسی کا شکار ہونے کے باعث مناسب جگہوں پر خرچ نہ کیا گیا۔اب اصلاحات کے مطابق ۸۰ فیصد فنڈ انہی کرپٹ بیوروکریسی کے اختیار میں ہوگا۔تو ان اصلاحات کا کوئی واضح فائدہ تو نہ ہوگا۔لوگ ترقی چاہتے ہیں؛ نا تو ایف سی آر نے وفاقی حکومت کو اس سے روکا تھا اور نا ہی لوگوں نے۔لیکن وفاقی حکومت نے خود ہی سڑکیں، ہسپتال اور یونیورسٹیاں قائم کرنے کا قدم نہیں اٹھایا۔فاٹا کے تعلیم اور روزگار کے شعبوں میں موجودہ خلیج کو مدنظر رکھتے ہوئے، حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ ان اصلاحات میں یہ بات واضح کردے کہ تعلیمی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں فاٹا کے موجودہ کوٹہ اور وضائف کو ختم کردیا جائے گا یا بڑھا دیا جائے گا۔اگر نہیں، تو ان اصلاحات کی حمایت کرنا لوگوں کو مہنگا پڑے گا۔عوام چاہے انضمام کے حق میں ہو یا نا ہو، وہ اصلاح چاہتی ہے؛ فاٹا میں صحت، تعلیم اور دیگر سہولیات کی ترقی چاہتی ہے۔

فاٹا اصلاحات کے اہم تجاویز یہ ہیں:

۱۔فاٹا کے خطے کا خیبر پختونخواہ میں انضمام۔

۲۔قبائلی عوام کی بحالی اور جنگی بنیادوں پر قبائلی علاقوں کی تعمیرِ نو اور مقامی رہن سہن کے احیاء کو ترجیح۔

۳۔فاٹا کی سماجی اور اقتصادی ترقی کے منصوبہ میں بنیادی ڈھانچہ اور آب پاشی ،معدنی ترقیاتی پروگرام اور صحت ،تعلیم ،حرفی تربیت اور خصوصی مراعات کے ساتھ صنعتی زونز کے قیام کے لئے مربوط منصوبے۔

۴۔۲۰۱۷ کے اختتام سے پہلے فاٹا میں جماعتی بنیادوں پر مقامی اداروں کے انتخابات۔

۵۔فاٹا میں قانونی اصلاحات کی جائے جس میں ایف سی آر کو منسوخ کیا جائے اور 'قبائلی علاقہ جات رواج ایکٹ' نافذ کیا جائے۔

۶۔لیویز کی ایجنسی پولیس کے فرائض سرانجام دینے کے لیے استعداد سازی۔

۷۔بندوبست اراضی؛ فاٹا میں بینک چلانے اور نجی سرمایہ کاری کو راغب کرنے کے لیے جائیداد کا ریکارڈ میں لانا۔

ان اصلاحات کے اس نقطہ پر بھی سوال اٹھتا ہے جو کہ 'رواج' کو منظّم قانون بنانے کی تجویز کرتی ہے۔نوید احمد شنواری، جنہوں نے پانچ جلدوں پر مشتمل 'انڈرسٹینڈنگ فاٹا' نامی کتاب کو تحریر کیا، اس نقطہ کا تجزیہ کرتے ہوئے سوال اٹھایا کہ 'رواج کو ہم قانونی طور پر کیسے مرتب کر سکتے ہیں؟ رواج تو متحرک اور مسلسل طور پر بدلتا رہتا ہے۔اگر فاٹا کو خیبر پختونخواہ کے ساتھ ضم کرنے کی تجویز دی جا رہی ہے تو پھر رواج کو برقرار رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ موجودہ قوانین کو فاٹا میں بھی توسیع کرنا چاہیے۔' سینیٹر فرحت اللہ بابر نے رواج ایکٹ کے مسئلے کو پارلیمانی بحث میں شامل کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ 'اگر انضمام کے بعد بھی فاٹا میں رواج کو لاگو کیا گیا تو فاٹا کے لوگ اگلے ۲۰۰ سال تک اس قانون کے غلام رہیں گے۔' جرگہ اور ملک راج کو غیر ضروری طور پر فروغ دیا جاتا ہے، اگر ان ملکوں کا اتنا اثر رسوخ ہوتا تو یہ بلدیاتی انتخابات میں کیوں نہیں حصہ لیتے۔

کون لوگ انضمام کو مرکزی دھارے میں لانے کا سبب کہہ کر فاٹا میں ترقی لانے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔فاٹا میں اصلاحات افغانستان میں امن کے ساتھ منسلک ہے۔ دہشتگردی کے خلاف طویل جنگ لڑنے کے بعد فاٹا کی عوام باقاعدہ طور پر اصلاحات کی مستحق ہیں۔لیکن وہ اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے ترقی کے مستحق ہے نا کہ اصلاح کے نام پر اپنی ۳۵۰۰ سالہ پرانی شناخت کو ضم کر کے۔ان سب شک وشبہات کو اور مخالفتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان اصلاحات کی نوعیت کی فہم وضاحت کرنی ہوگی تا کہ پانچ سالہ منتقلی مدت ان اصلاحات کو لاگو کرنے کے لئے کافی ہو۔فی الحال فاٹا اصلاحات کے نقات اتنے غیر واضح ہیں کہ کئی لوگ یہ شبہ رکھتے ہے کہ فاٹا اگر خیبر پختونخواہ کا حصہ بن بھی گیا تب بھی وہ پچھلے ۷۰ سال کی طرح اگلے ۷۰ سال ایک غیر مستحکم علاقہ ہی رہے گا۔

مضمون نگار انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں۔
info@individualland.com

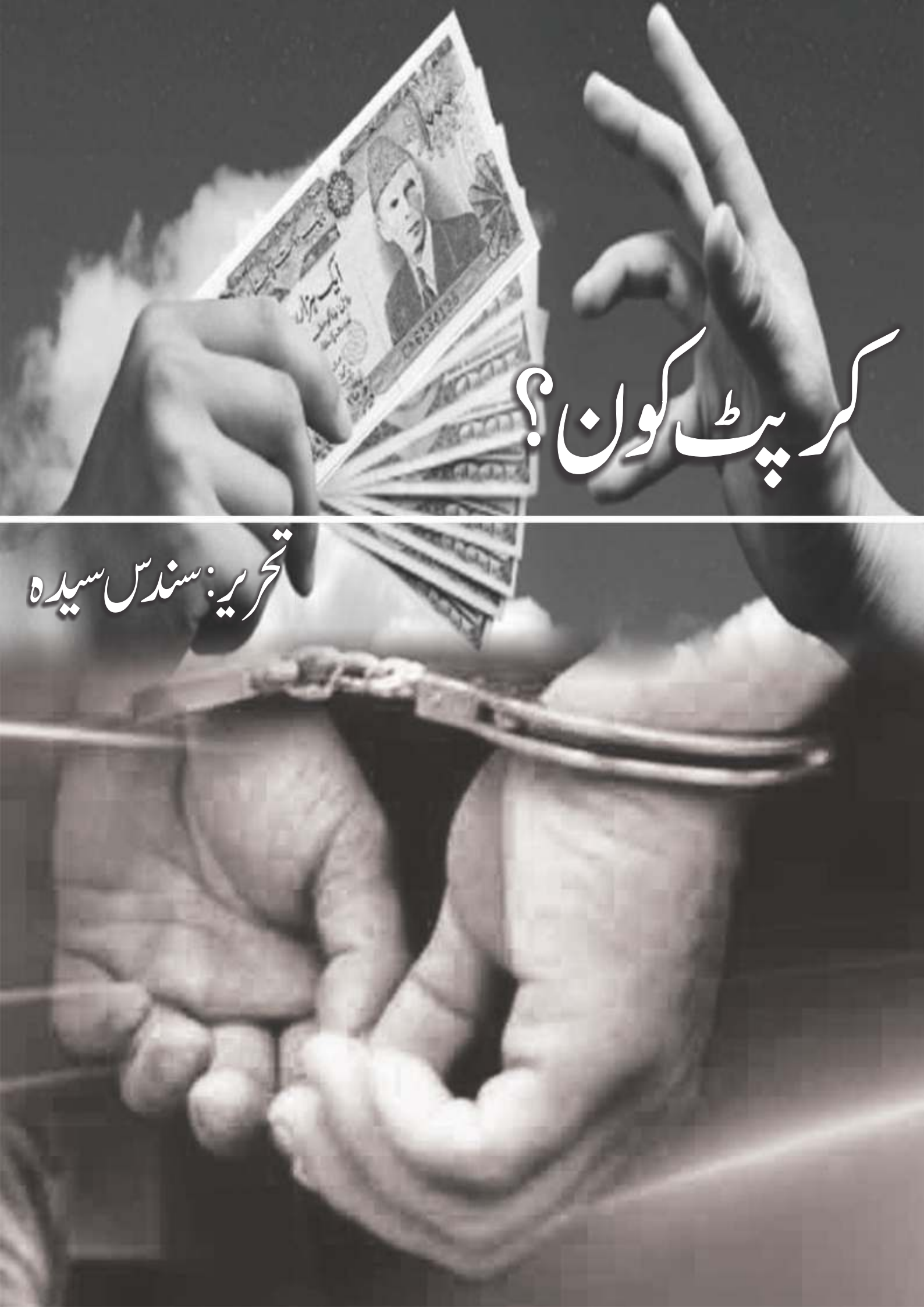

کرپٹ کون؟

تحریر: سندس سیدہ

میں بہت خوش ہوں کیونکہ میرے چھوٹے سے شہر میں ایک پل اور سڑک کا افتتاح ہونے جا رہا ہے جس کی بدولت چھوٹے شہر میں رہنے والوں کو تعلیم، صحت اور روزگار کے مواقع حاصل کرنے کے لیے بڑے شہروں تک رسائی میں سہولت ہو جائے گی۔ مجھے بھی آج بڑے شہر جانا ہے اور اس کے لیے میں جلدی سے گھر سے نکلی کہ آج اس پل سے گزرتی ہوئی اس بہترین سڑک سے گزروں گی جس کی آج افتتاحی تقریب ہے۔ پل کے پاس پہنچنے پر عجب سماں دیکھا۔ ایمبولینس سائرن بجاتی گزر رہی ہیں، پولیس نے جگہ کو سیل کر دیا ہے۔ سامنے کا منظر دل دہلا دینے والا ہے۔ پل زمین بوس ہو چکا ہے۔ میرے شہر کے لوگ اس پل کی کرپشن کے نیچے آ کر ابدی نیند سو چکے ہیں۔ یہ تھی ملک میں ہونے والی بنیادی ڈھانچے کی ترقی کی ایک مثال، پاکستان میں نہ جانے ایسی کتنی مثالیں بھریں پڑی ہیں۔ گاڑی کے ریڈیو میں خبر گونجنے لگی "ایک اور پل کرپشن کی نظر ہو گیا" یہ خبر سن کر میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ اس پل میں ہونے والی کرپشن کی گنگا میں کس کس نے ہاتھ دھوئے ہوں گے؟ یقیناً یہ ہی ہوا ہوگا کہ پل کا بجٹ بننے، ملنے اور لگنے کے ساتھ ساتھ اس پل پر کام کرنے والے تمام لوگوں نے صوابدید کے مطابق حصہ ڈالا ہوگا جو کہ بعد میں بھی عوام کے سروں سے ہی نکلنا تھا لیکن افتتاح سے پہلے ہی عوام کے سروں پر آ پڑا۔ اس سے پہلے بھی کئی ایسے کیس پکڑے جا چکے ہیں جن میں کرپشن کا انکشاف ہوا ہے لیکن کبھی عوام کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ احتساب کرنے والے اداروں نے الزام ثابت ہو جانے کے بعد کیا کیا؟ کیس پر کتنی پیش رفت ہوئی؟

کرپشن کا خاتمہ کیسے ممکن ہے؟ اسی سلسلے میں چند روز پہلے میری نظر سے ایک سروے گزرا تھا جو کہ قومی احتساب بیورو کی ویب سائیٹ پر تھا کہ پاکستان سے کرپشن کا خاتمہ کیسے ممکن ہے؟ جس کے ممکنہ جوابات دیے گئے تھے: ۱) اسلامی اصولوں پر عمل کر کے۔ ۲) تمام کرپٹ لوگوں کو معاف کر کے۔ ۳) کرپٹ لوگوں کو سخت سزائیں دے کر۔ ۴) کرپشن کی لوٹی ہوئی رقم واپس وصول کر کے۔ ۵) لوگوں کو تعلیم دے کر ۶) انسداد کرپشن کے اداروں کو مئوثر بنا کر۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اگر نیب کو قوانین کے موجود ہوتے ہوئے خود ہی نہیں معلوم کہ کیا کرنا چاہئے تو پھر یہ ادارہ کس لیے بنایا گیا ہے؟ ۶ مارچ ۲۰۱۶ء تک کسی نے ویب سائیٹ پر اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا، اور شکر ہے کہ جواب نہیں دیا کیونکہ اگر ۲ نمبر آپشن درست ہو جاتی تو کیا ہوتا؟

بہر حال میں نے بھی اس سوال کا جواب نہیں دیا کیونکہ میرا جواب ان میں سے کوئی نہیں ہے۔ میرے خیال میں پاکستان میں موجود قوانین پر عمل کر کے کرپشن کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے، جس میں قانون کی بالادستی، اور قانون کی نظر میں سب برابر ہوں اسکے بعد انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانا بھی ضروری ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ اشد ضروری ہے کہ کرپشن کی روک تھام کے لیے بنائے گئے قوانین پر سختی سے عمل کیا جائے جن میں اینٹی کرپشن ایکٹ، آرڈیننس، اسٹیبلشمنٹ رولز مجتسب، وفاقی محتسب ایکٹ اور آرڈیننس کے دفاتر کا قیام، وفاقی کورٹ، وفاقی تفتیشی ایجنسی ایکٹ اور قوانین اور قومی احتساب آرڈیننس وغیرہ شامل ہیں۔ کیا کرپشن سے چھٹکارا پانے کے لیے قومی احتساب بیورو، وفاقی تفتیشی ایجنسی، احتساب کورٹ کے احتساب کو یقینی بنا سکتے ہیں؟ کیا قوانین پر سختی سے عمل درآمد کیا جا سکتا ہے؟

دراصل قومی اور سرکاری املاک کا ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنا کرپشن سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ اگر پاکستان میں ہزاروں کی تعداد میں خواتین زچگی کے دوران بر وقت ہسپتال نہ پہنچ پانے کی وجہ سے مر جاتی ہیں تو اسکے ذمہ دار وہ لوگ بھی ہیں جو ایمبولینس کی مد میں مختص کی جانے والی رقم میں ہیر پھیر کر رہے ہیں۔ ویسے تو کرپٹ افراد کا تعلق اور عہدہ کوئی بھی ہو سکتا ہے، لیکن عمومی طور پر کرپشن کا تعلق اشرافیہ یا سیاست دانوں سے جوڑا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جس کے پاس جتنے زیادہ اختیارات ہوں گے اس کے پاس کرپشن کے اتنے زیادہ مواقع ہوں گے لیکن اس بہتی گنگا میں سبھی حسبِ توفیق ہاتھ دھوتے ہیں۔ یہ بات بجا ہے کہ کرپشن کے ناسور کی ہمیشہ بالائی ڈھانچے سے شروعات ہوتی ہے اور نچلی سطح تک پھیل جاتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے کینسر کو چھیڑ دیا جائے تو وہ تمام جسم میں پھیلتا چلا جاتا ہے اور جسم کو مفلوج کر دیتا ہے۔ پاکستان کا کون سا ادارہ ہے جو کرپشن کی نظر نہیں ہوا؟ ریلوے، پی آئی اے، اسٹیل مل، واپڈا، پی ٹی سی ایل نیشنل انشورنش کارپوریشن، پولیس، فوج، عدلیہ گاہے بگاہے ہر ادارے کے بارے میں کرپشن کی خبریں سننے کو ملتی ہیں۔ اسی کے برعکس اگر میں یہ کہوں کہ پاکستان میں کتنے لوگوں کو کرپشن کے جرم میں سزا ہوئی ہے تو شاید چند ہی لوگ فہرست میں دکھائی دیں اور وہ بھی وہ لوگ ہوں گے جو مجھ جیسے عام لوگ ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ بڑی بڑی کرپشن کرنے والوں کے بڑے چرچے ہوتے ہیں لیکن دوسری جانب دیکھا جائے تو بجلی، پانی، گیس اور ٹیکس چوری کرنے میں سینکڑوں لوگ شامل ہوتے ہیں۔ اس بات کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ "سے نو ٹو کرپشن" کا پھندا ہر ایک کے قد کے مطابق

ہو، تا کہ کوئی بھی اس سے بچ نہ سکے۔

اداروں کی سطح کی کرپشن کی زیادہ بات کی جاتی ہے لیکن حال ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ خیبر پختونخواہ میں ہسپتالوں میں فری ادویات دی جاتی ہیں اور غریب کے لیے بہت آسانی ہوگئی ہے۔ میں ابھی اسکی خوشی بھی نہیں منا سکی تھی کہ ایک خبر آ گئی کہ ہم میں سے ہی کچھ لوگ مفت ادویات مختلف پرچیوں پر لے لیتے ہیں اور میڈیکل اسٹور پر جا کر بیچ دیتے ہیں۔ اس صورت میں جب حکومت بھی کام کر رہی ہے لیکن بھیڑیے ہمارے ہی درمیان موجود ہیں تو کیا لائحہ عمل ہونا چاہئے؟ کیونکہ اس کی وجہ سے آپکے اور میرے بچے، ماں باپ، بہن بھائی ادویات نہ ہونے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ کرپشن ایسا کھیل بن چکا ہے جس میں اگر میں ۹۰ کڑور کی کرپشن کروں تو پلی بارگین کے ذریعے ۱۰ لاکھ میں سودا ختم کر کے اپنی جان چھڑوا سکتی ہوں۔

دوسری جانب ایک اور مثال کے طور پر پولیس کے چند افسران کے لیے بجٹ رکھا جاتا ہے جس کو وہ کہیں بھی تحقیقات کرنے یا خفیہ کام کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں اور اس کے بارے میں ان سے کوئی جواب طلبی نہیں ہوتی کہ انہوں نے بجٹ کہاں خرچ کیا اور کس کو دیا۔ بلا شبہ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ تحقیقات کے عمل میں شامل لوگوں کو تحفظ فراہم کیا جا سکے اور ان کو کسی قسم کے خطرات لاحق نہ ہوں لیکن اگر وہ افسر بجٹ کی مد میں رکھے گئے پیسے اپنی جیب میں ڈال لے اور کہیں خرچ نہ کرے تو بھی کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ ہر اس جگہ پر جہاں کسی کے پاس کوئی بھی اختیارات موجود ہوں اور احتساب کا عمل حزب کر دیا جائے وہاں شفافیت کے عمل کو یقینی بنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میزوں کے اوپر سے جو چند روپے گزرتے ہیں وہ تو کہیں نا کہیں کیمروں میں آ جاتے ہیں اب کہیں میزوں کے نیچے بھی کیمرے لگانے کی ضرورت ہے۔ تا کہ خدا کا خوف ہونا ہو لیکن دنیا میں سزا ملنے کے خوف سے ہی کہیں کرپشن کی روک تھام ممکن ہو جائے۔ کیونکہ کرپشن تو ہم دنیا ہی کی آسائشوں کے لیے کر رہے ہیں۔ ہم قانون کی حکمرانی کی بات تو کرتے ہیں لیکن اگر واقعی پاکستان میں قانون کی بالا دستی ہوگئی تو کیا حالات ہوں گے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ ہماری جیلیں بھر جائیں گی، خاص طور پر اشرافیہ کے لیے بنائی گئیں اسپیشل سہولیات والی جیلیں زیادہ تعداد میں بنانی پڑ جائیں گی۔ میں اگر پانامہ کیس، ایان علی، توقیر صادق، ریکوڈک اور رینٹل پاور کی بات کروں تو کس منہ سے کروں؟ عدلیہ ثبوت مانگتی ہیں، ہم جعلی ثبوت پیش کر دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں پکڑ صرف ان لوگوں کی ہوتی جو انصاف نہیں خرید سکتے اور انصاف بہت مہنگے داموں بکتا ہے۔

کرپشن کے سلسلے کو ختم کرنے کے لیے فلسفے اور تدابیر کام نہیں آتیں بلکہ اس کو روکنے کے لیے قوانین پر عمل نہایت ضروری ہے۔ پاکستان میں کرپشن کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہیں پر حکومتی ادارے زوال کا شکار ہو رہے ہیں، کہیں عوام کی دولت سے سیاسی اشرافیہ مستفید ہوتے دیکھائی دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے کرپشن کے مسئلے کو سماجی، احتسابی، قانونی کے بجائے سیاسی بنا دیا گیا ہے۔ پاکستان میں ہر کرپٹ بندہ کرپشن کا 'مخالف' ہے۔ ہر ایک کا ماننا ہے کہ کرپشن ختم ہونی چاہئے لیکن پھر بھی یہ ناسور پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ کہیں تو کوئی مسئلہ ہے جو اس ناسور کے جڑ سے ختم کرنے میں رکاوٹ کا باعث بن رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس کبوتر کی طرح ہیں جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور پھر نتیجہ یہ کہ اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑ جاتے ہیں۔ یا پھر "سے نو ٹو کرپشن" والے میسج کا ترجمہ ہم یہ کر بیٹھے ہیں کہ "کرپشن کو کچھ مت کہو"۔ کیونکہ ایسا بھی نہیں کہ پاکستان میں انسداد کرپشن کے قوانین اور ادارے موجود نہیں ہیں۔ بلکہ ہر ایک کرپشن کے ادارے پر دوسرا کرپشن کا ادارہ ہے لیکن نتائج دکھائی نہیں دیتے۔ تھوڑا بہت کرپشن کا حل جمہوری عمل کے تسلسل سے ہی جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے جو ہمارے ہاں ناپید ہے۔ پارلیمنٹ میں کرپشن کے خاتمے کے لیے بہترین قوانین اور بہتر ادارے تو بن جاتے ہیں لیکن نتائج پھر بھی نظر نہیں آتے، کیونکہ اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا کیا ۷۰ سال میں ہم نے قانون اور ادارے بنانا سیکھا ہے اس قوانین پر عمل اور اداروں کو فعال کرنے کے لیے کیا مزید ۷۰ سال چاہییں؟

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں۔
info@individualland.com

اِسے جمہوریت کہیں، یہ ضروری تو نہیں

ذوالفقار حیدر

اگست ۲۰۱۷ میں پاکستان کو آزاد ہوئے ۷۰ سال گزر چکے ہوں گے۔ انسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو ۷۰ سال میں انسان بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے مگر پاکستان کی بات کریں تو شاید یہ کہنا غلط نا ہوگا کہ ابھی تو ہمارے ملک نے چلنا شروع کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع کے پچاس ساٹھ سالوں میں تو فوجی اور جمہوری حکومتوں کے درمیان آنکھ مچولی کا کھیل جاری رہا اور بیچارے ملک کو بڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب پچھلے تقریباً دس سالوں سے صورتحال قدرے بہتر ہے۔ ایسا کہنے سے میری مراد ہرگز یہ نہیں کہ ہم ایک خودمختار ملک بن چکے ہیں۔ یقیناً مالی اعتبار سے ہم بہت سے دوسرے ممالک پر منحصر ہیں اور 'عربوں' کے احسانوں اور عربوں روپے کے قرضوں تلے دبے ہوئے ہیں۔

یہاں میری مراد پاکستان میں جمہوری نظام کا قیام ہے۔ پاکستانی ریاست کے چار اہم ستون ہیں جنہیں عام زبان میں وزیراعظم اور صدر، پارلیمان، عدلیہ اور میڈیا کہا جاتا ہے۔ ایک جمہوری نظام کی سلامتی ان چاروں ستونوں پر منحصر ہے۔ ان میں سے کسی ایک ستون کے کمزور پڑنے سے پورے جمہوری نظام کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور پاکستان کی تاریخ میں ایسا کئی بار ہوا، جہاں ہم نے دیکھا کہ کبھی کسی وزیراعظم کو کرپشن کے الزام پر اپنے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور کبھی اسمبلی کو تحلیل کر دیا گیا، کہیں صدر کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا اور کبھی عدلیہ کا گھیراؤ کیا گیا۔ دوسری طرف میڈیا، جسے ریاست کے چوتھے ستون کا درجہ دیا جاتا ہے ایک لمبے عرصے تک ریاستی کنٹرول میں رہا اور اُسے آزادانہ کام کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ اب ہمارے ملک کا میڈیا آزاد اور خودمختار ہے البتہ کیا وہ ذمہ دار بھی ہے؟ اس موضوع پر الگ سے بحث کی جاسکتی ہے۔

دیگر جمہوری معاشروں میں جمہوری سطون اور نظام اس قدر مضبوط ہیں کہ کسی بھی الزام کی صورت میں وہاں کے وزیر ہوں یا وزیراعظم اپنے دفاع کی بجائے مستعفی ہونا پسند کرتے ہیں کیونکہ اُنہیں اپنے قائم کردہ نظام پر بھروسہ ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف ہمارے ہاں وزیراعظم تو چھوڑیے ایک سرکاری نوکری کرنے والا گریڈ دوم کا ملازم بھی اپنے دفاع میں وہ سب کچھ کر گزرے گا جو وہ کر سکتا ہوگا۔ تو یہ کہنا غلط نا ہوگا ہمیں بحیثیت قوم جمہوری ہونے میں کچھ وقت لگے گا اور اس کی وجہ وہی ہے کہ ہم نے کبھی جمہوری نظام اور جمہوریت کے سطونوں کو بڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں وہ جمہوری ثقافت ہی موجود نہیں جو دیگر ممالک میں ہے۔ یہاں تک کہ بھارت جو ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا تھا وہاں بھی جمہورت ہم سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔

یہاں پر ضروری ہے کہ اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ کیا ہم بحیثیت فرد، قوم اور معاشرہ جمہوری ہیں؟ کیا اپنے سیاستدانوں اور سیاسی نظام سے جو ہمیں اُمیدیں وابستہ ہیں کیا وہ حقیقت پر مبنی ہیں یا پھر ہم کسی بھیڑ چال کا حصہ بننے کی کوشش کر رہے ہیں؟ کیونکہ اگر ہم اپنے قول و فعل میں جمہوری نہیں ہیں تو ہم کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ہمارے حکمران جمہوریت پر مبنی رویہ اختیار کریں گے؟ کیونکہ ہمارے حکمران بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں اور اسی معاشرے کی اقدار کی عکاسی کرتے ہیں۔ کیا ہمارے معاشرے میں کرپشن، رشوت، سفارش اور اقربا پروری ختم ہو چکی ہے؟ کیا ہم سب کہیں نا کہیں اپنے معاملات میں ڈنڈی نہیں مارتے؟ تو پھر ہم اپنے حکمرانوں سے یہ سب اُمیدیں کیوں لگاتے ہیں؟

یقیناً یہ ایک اہم سوال ہے مگر ایک سیاستدان یا حکمران عام آدمی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے حلقے کی عوام کا منتخب نمائندہ ہوتا ہے اور لوگ اسی لئے ووٹ دیتے ہیں کہ وہ اُن کے مسائل کا حل نکالے گا۔ اسی وجہ سے ایک حکمران کیلئے جمہوری ہونا اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ووٹروں کی اُمیدوں پر پورا اُتر سکے۔ اور یقیناً معاشرے اسی طرح بہتری کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جب آوے کا آوہ ہی بگڑا ہوا ہو تو کیا اُمیدیں اور کہاں کی جمہوریت؟

جمہوریت کی یہی خوبصورتی ہے کہ حکومتیں چاہے کتنی ہی نااہل کیوں نا ہوں، جمہور کی طاقت اُنہیں بہتری کی طرف بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔اسی طرح صوبائی حکومتوں کے درمیان بھی مقابلے کی فضا قائم ہوتی ہے جس سے فائدہ عوام ہی کو پہنچتا ہے۔اس کی ایک بہترین مثال خیبر پختونخواہ حکومت کا معلومات تک رسائی کے قانون کو متعارف کروانا تھا۔اس قانون کو دنیا کے بہترین معلومات تک رسائی کے قوانین میں شامل کیا گیا۔اس قدام کے کچھ ہی عرصے بعد حکومت پنجاب نے بھی معلومات تک رسائی کا قا ن متعارف کروایا اور اس سلسلے میں عملی اقدامات بھی شروع کر دیے۔اب صوبوں کے درمیان مقابلے کا سب سے زیادہ فائدہ عوام کو ہوا اور جمہوریت مزید مضبوط ہوئی۔

آخر میں ہمارے حکمرانوں اور حکومتوں کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ جمہوریت صرف الیکشنز اور حکومت میں آنے کا نام نہیں بلکہ عوام کی اُمیدوں پر پورا اُترنے کا نام ہے۔ پچھلے ۷۰ سالوں کا موازنہ کرنے سے تو مجھے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے ملک میں نظام تو قائم رہا مگر وہ جمہوری نہیں رہا اور آج بھی جمہوریت کے نام پر جو نظام قائم ہے وہ کچھ آدھا تیتر آدھا بٹیر ہی ہے۔البتہ میں پُر اُمید ضرور ہوں کہ کم از کم یہ نظام پٹڑی پر چڑھ چکا ہے اور چلتے چلتے یہ کبھی تو جمہوریت نامی اسٹیشن پر ضرور پہنچے گا۔

مصنف انڈیویجول لینڈ پاکستان مین پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں:
info@individualland.com

ہندو میرج ایکٹ

تحریر: ریحان علی

آئے روز نوجوان ہندو لڑکیوں کو گھروں سے اغوا کر کے انہیں زبردستی مسلمان کرنے اور بااثر لوگوں سے شادی کروانے اور نابالغ لڑکیوں کی پسند کی شادی کے لیے مذہب تبدیل کر لینے جیسے واقعات کی خبریں ہمیں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ایک ۱۶ سال کی ہندو لڑکی جس کا تعلق سندھ کے شہر ڈھرکی سے ہے اس کو تین سال پہلے اس کے گھر سے اغوا کیا گیا اور زبردستی مسلمان کر کے اس کی شادی کروادی گئی۔اس کے والد کا کہنا تھا کہ جب ہم نے اپنی بیٹی کی رہائی کے لیے آواز اٹھائی تو ہمیں دھمکیاں ملنی شروع ہو گئیں جس کی وجہ سے ہمیں کراچی میں پناہ لینی پڑی۔اسی طرح کا ایک اور واقعہ سندھ کے شہر عمر کوٹ میں پیش آیا جہاں ایک ہندو لڑکی کو اغوا کیا گیا تھا اور اس کو عدالت میں پیش کر کے اس کو مسلمان قرار دینے کے ساتھ اس شخص کی بیوی بنا دیا جس نے اس لڑکی کو اغوا کیا تھا۔لڑکی کا کہنا تھا کہ وہ ایک مہینے تک اغوا کاروں کے پاس رہی جہاں اس کو مارا بھی گیا اور عدالت میں پیش کر کے اس کو زبردستی مسلمان کر کے شادی کروادی گئی اور پولیس کو رشوت بھی دی گئی۔لڑکی کے والدین کو اپنی بیٹی واپس لینے کے لیے ہر چیز بیچنی پڑی اور اس گاؤں سے منتقل ہونا پڑا۔یہ مسائل کئی سالوں سے جاری ہیں لیکن ریاست پاکستانی ہندوؤں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ان میں سے زیادہ تر واقعات اندرون سندھ میں پیش آتے ہیں، جہاں پر ریاست کمزور یا پھر غیر موجود ہے۔تحقیق پر مبنی ادارہ ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ پاکستان کی ۲۰۱۵ کی شائع ہوئی رپورٹ فورسڈ کنورشن آف ریلیجن کے مطابق پاکستان کے صوبہ سندھ میں پچھلے ۱۵ سالوں میں مذہب کی جبراً مذہب تبدیل کرنے کا تناسب ۱۹۴۷ سے ۱۹۸۷ تک پیش آنے والے واقعات کے برابر ہیں۔صوبوں کے حوالے سے ہندو برادری کی تعداد کی بات کی جائے تو صوبہ سندھ میں ہندو برادری کی تعداد ۶.۵ فیصد ہے، پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں ہندو برادری کی تعداد ایک فیصد ہے جب کہ بلوچستان میں ہندو برادری کی تعداد ایک فیصد سے زائد ہے۔محتاط اندازے کے مطابق بلوچستان میں ایک لاکھ ہندو رہائش پذیر ہیں جس میں زیادہ تر کوئٹہ میں رہتے ہیں۔یہ ہی وجہ ہے کہ ایسے قوانین موجود ہونے چاہییں جو کہ تمام مذاہب کے تحفظ کو یقینی بنائیں۔اسی سلسلے میں سندھ جہاں ہندو برادری کی تعداد ۶.۵ فیصد سے زائد ہے وہاں پر ہندو میرج ایکٹ کا نفاذ ہو گیا ہے۔اس کے علاوہ یہ ایکٹ بلوچستان، خیبر پختونخواہ اور پنجاب میں بھی لاگو ہو گا۔

مسلمانوں کے نکاح نامہ کی طرح اس قانون کے تحت ہندوؤں کی شادیاں بھی رجسٹر ہو پائیں گی، اس فارم کو شادی پرات کہتے ہیں۔یہ دستاویز جبری شادیوں کی روک تھام کے لیے کارآمد ثابت ہو گا۔جبری شادیوں کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندو خواتین کے پاس اپنی شادی کے کوئی دستاویزات موجود نہیں ہوتے تھے۔اس ایکٹ میں شادی سے متعلق طریقہ کار، علیحدگی اور دوبارہ شادی اور شادی کی کم سے کم عمر جو دونوں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ۱۸ سال ہے اس ایکٹ میں شامل کی گئی ہے۔کچھ ہندو قانون سازوں نے اس ایکٹ کے چند شکوں پر اعتراض کیا ہے جیسے کہ ہندوؤں کے مذہب میں علیحدگی کی اجازت نہیں ہے۔اس کے علاوہ مسلمان مذہبی جماعتوں نے اس ایکٹ کی مخالفت کی ہے کیونکہ ان کی رائے میں اس ایکٹ کے تحت پاکستان ایک سیکولر اور لبرل ملک بن جائے گا۔لیکن مجموعی طور پر معاشرے کے ہر طبقے نے اس ایکٹ کی حمایت کی ہے۔یہ ضروری ہے کہ ہندو قانون سازوں کے اعتراضات کو مدنظر رکھتے ہوئے ترامیم کو یقینی بنایا جائے۔

۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک اس ریاستی قانون کی عدم موجودگی میں ہندو اپنی شادیاں رجسٹرڈ نہیں کروا سکتے تھے۔ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے مطابق شادی کا رجسٹریشن سرٹیفکیٹ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت سی مراعات سے محروم رہ جاتے تھے۔جیسے کہ بڑی تعداد میں بیوائیں غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں کیونکہ وہ اپنی شادی کے ثبوت فراہم کرنے میں ناکام رہتی تھیں اور اپنے شوہر کی جائیداد میں حصہ کا دعوی نہیں کر پاتی تھیں۔جو کہ پاکستان کے قانون کے مطابق ان کا حق ہے۔بہت سے ہندو جوڑوں نے شادی کا سرٹیفکیٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہراساں کیے جانے کی شکایت بھی کی ہے۔

۱۔ ہندو شادی کی شرائط

۔ ہندو شادی اس وقت درست قرار دی جائے گی جب ان شرائط پر عمل ہوگا۔

۔ شادی کے وقت دونوں پارٹیاں بالغ ہوں اور صحیح مشورہ دینے کے قابل ہوں۔

۔ دونوں میاں بیوی کی عمر ۱۸ سال سے زیادہ ہو۔

۔ شادی سے پہلے دونوں میاں بیوی ساتھ نہ رہ رہے ہوں۔

۲۔ ہندو شادی کے لیے تقریبات

ہندو شادی کو روایتی رسومات کے مطابق درست قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ ہندو شادی کی رجسٹریشن

۔ ہر ہندو شادی اس بل کے تحت رجسٹر ہوگی۔ یہ ہندو شادی کی رجسٹریشن ۱۵ دن میں مکمل ہونی چاہیے۔

۔ میرج رجسٹر ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے گا

۴۔ میرج رجسٹرار کے فرائض

۔ حکومت سرکاری نوٹیفکیشن کے تحت ضلع میں یا ان جگہوں میں میرج رجسٹرار کے ممبران کو مقرر کرے گا جہاں پر ہندو کمیونٹی کی تعداد زیادہ ہوگی

۔ میرج رجسٹرار یا کسی شخص جس کو اس نے خود مقرر کیا ہو اس کو ہی ہندو کی شادی رجسٹر کرنے کی اجازت ہوگی۔

پاکستان کے مختلف شہروں میں ہندوؤں کی آبادی (According to 1998 census!)

صوبہ سندھ

تھرپارکر	۱،۱۰۹،۹۹۴
حیدرآباد	۱،۰۴۷،۵۰۱
عمرکوٹ	۹۴۶،۱۸۵
میرپورخاص	۸۸۹،۲۶۵
سانگھڑ	۸۷۸،۰۶۱

صوبہ پنجاب

رحیم یار خان	۲۲۰۵۱۸
بہاولپور	۶۷۸۱۸
سیالکوٹ	۱۰۷۳۱
قصور	۶۳۴۵
لاہور	۴۸۲۱

صوبہ خیبر پختونخواہ

فاٹا	۵۷۶۳
پشاور	۳۶۷۲
کوہاٹ	۲۳۹۴
نوشہرہ	۱۹۹۸
ڈیرہ اسماعیل خان	۱۴۱۳
بونیر	۱۱۶۷

صوبہ بلوچستان

جعفرآباد	۱۹۵۸۷
لسبیلہ	۱۳۵۱۲
بولان	۱۳۳۸۹
کوئٹہ	۱۲۵۲۵
خضدار	۸۸۸۶

پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایسا قانون بنا ہے جو ہندو شادیوں کے اندراج اور شادی کی تحلیل کے لیے طریقہ کار فراہم کرتا ہے۔ دفعات کے مطابق لڑکے اور لڑکی کو باعاقل، رضامند ہونا اور دونوں کو ۱۸ سال سے کم عمر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایکٹ عدالتی علیحدگی کے تصور کو فروغ دیتا ہے جہاں پر شادی برقرار رہتی ہے جب کہ ان پر ساتھ رہنے کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ اگر میاں بیوی ایک سال یا اس سے زائد عرصے سے الگ رہ رہے ہوں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنا نہ چاہیں اور وہ شادی ختم کرنے میں رضامند ہوں تو اس کی شادی کی تنسیخ ہو جائے گی۔ شادی کی منسوخی کے چھ ماہ کے بعد فریقین دوبارہ شادی کر سکتے ہیں اور یہ اقدام غیر قانونی نہیں ہوگا۔ اس ایکٹ کے مطابق ہندو بیوہ کو بھی اپنے خاوند کی وفات کے چھ ماہ کے بعد دوبارہ شادی کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ قائمہ کمیٹی کی طرف سے اس ایکٹ کے بارے میں پیش کی گئی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی مرد یا عورت بغیر کسی معقول عذر کے دوسرے سے میل جول چھوڑ دے تو متاثرہ فریق عدالت میں پٹیشن کے ذریعے حقوق زوجیت کے لیے دعویٰ دائر کر سکتا ہے اور اس میں عذر کا ثبوت اس فریق کو پیش کرنا ہوگا جس نے میل جول ترک کیا۔ اس ایکٹ میں اس بات کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اگر کوئی ہندو شخص اپنی پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرتا ہے تو یہ ایک قابل سزا جرم تصور ہوگا۔ اگر کوئی شخص ہندو شادی کی رجسٹریشن کی بابت بنائے گئے قواعد کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس ایکٹ کے تحت اس کی سزا چھ ماہ قید ہے۔ اس ایکٹ میں ہندوؤں کی شادی، خاندان، ماں اور بچے کو جائز تحفظ فراہم کرنے کی بات کی گئی ہے۔ اس ایکٹ کے تحت بیوی اپنی شادی ختم کرنے کے لیے پٹیشن پیش کر سکتی ہے۔ بیوی کو شادی ختم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے بشرطیکہ شوہر نے دو سال کے عرصے میں اسے نظر انداز کیا ہے اور اس کی دیکھ بھال کرنے میں ناکام رہا ہے۔ بیوی کو شادی ختم کرنے کا اس وقت بھی اختیار ہے اگر اس کے شوہر کو چار سال یا اس سے زیادہ سال کی قید کی سزا سنا دی جائے۔ بیوی کو شادی ختم کرنے کا اس وقت بھی اختیار ہے کہ اگر اس کی شادی ۱۸ سال سے کم عمر میں ہوئی اور اس نے ۱۸ سال کے ہونے سے پہلے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس ایکٹ سے پہلے جتنے بھی ہندو شادیاں ہوئی ہیں ان کو درست تصور کیا گیا ہے۔ ہندو کمیونٹی کے تحفظ کے لیے حکومتِ پاکستان کی طرف سے یہ ایکٹ پاس کرنا ایک جرات مندانہ قدم ہے

لیکن یہ صرف آدھا کام ہے کیونکہ ایکٹ کا پاس ہونا ہی صرف ضروری نہیں اس پرعمل درآمد بھی بہت ضروری ہے۔ پاکستان کے قیام کو ۷۰ سال ہو چکے ہیں اور ان ۷۰ سالوں میں ہندو برادری کے تحفظ کے لیے اس ایکٹ کا پاس ہونا بہت خوش آیند ہے اور ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ ایکٹ جس طرح پاس ہوا ہے اس طرح اگلے ۷۰ سال میں اس ایکٹ پرعمل درآمد بھی ہو اور یہ ہندو کمیونٹی کے تحفظ کے لیے اہم کردار ادا کرے اور مفید ثابت ہو۔

مصنف انڈویجوئل لینڈ پاکستان مین پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں:
info@individualland.com

ہمارا قومی کھیل کتاب تک محدود کیوں؟

تحریر: انعم باسط

پاکستان میں حالات جیسے بھی ہوں ہم بہت زندہ دل قوم ہیں۔ خاص طور پر لاہور کے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت زندہ دل ہیں اسی لیے پاکستان سپر لیگ کے فائنل کو ہم سب نے مل کر ان زندہ دل لوگوں کے شہر میں کامیاب بنا دیا۔ میچ دیکھ کر لگا ہم واپس امن کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔ ایک عرصے بعد عوام نے پُر امن فضا میں کسی کھیل کا سرور لیا۔ میں بھی اسی خوشی اور ولولے کے ساتھ قذافی اسٹیڈیم پہنچی جہاں پی ایس ایل کا فائنل ہونا تھا۔ ابھی میں اسٹیڈیم کے مین گیٹ تک ہی پہنچی تھی کہ میری نظر پاکستان ہاکی فیڈریشن (پی ایچ ایف) کے ہیڈ کوارٹر پہ پڑی جو کہ اسٹیڈیم کے بالکل مترادف سمت میں واقع ہے۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں یادوں اور سوالات کا امبار امڈ آیا۔ جن کا جواب پی ایس ایل کے انتظار میں کھڑی بھیڑ کے پاس تو نہ تھا پر اِس ہیڈ کوارٹر میں بسی ویرانی اور سکوت کا عالم جیسے خود ہی اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا۔ آخر ہاکی کا کھیل ہماری اسکول کی کتابوں تک محدود ہو کر کیوں رہ گیا؟ کیا یہ واقعی ہمارا قومی کھیل ہے؟ میں بھول چکی تھی کہ یہ فیڈریشن آفس اُس کھیل کے لیے تشکیل میں آیا تھا جس کو ہمارے مُلک میں قومی کھیل کی حیثیت حاصل ہے۔ آج اگر ہماری نوجوان نسل سے پوچھا جائے تو ان کو بین الاقوامی فٹبال کے کھلاڑیوں کے نام تو معلوم ہوں گے پر ہمارے قومی کھیل کے کھلاڑی یا اِس کھیل کی تاریخ کا کچھ بھی علم نہیں ہوگا۔

اگر آپ سے کہا جائے کہ فٹ بال کا ورلڈ کپ ہو رہا ہے جس میں برازیل، ارجنٹینا اور جرمنی شرکت نہیں کر رہے تو کیا آپ مان جائیں گے؟ میرے خیال سے تو یہ تصور ہی نا ممکن ہے اسی طرح ایک دور تھا جب ہاکی ورلڈ کپ میں پاکستان کا نہ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ورلڈ کپ کے فائنل میں جرمنی، پاکستان، ارجنٹینا، آسٹریلیا اور نیدرلینڈ جیسے ممالک ہی شرکت کرتے تھے۔ پاکستان اِن ممالک میں سب سے اول نمبر پر تھا۔ چار دفعہ ہاکی ورلڈ کپ جیتنے سے لے کر ریو اولمپکس کے لئے کوالیفائے نہ کر پانے کا سفر ہاکی کی تاریخ کو ہلا دینے والا ہے۔ سب سے پہلے اولمپکس ہی ہاکی کا واحد بنیادی ٹورنمنٹ تھا پر پھر ائیر مارشل نور خان کے دور میں اُنھوں نے انٹرنیشنل ہاکی فیڈریشن کو ہاکی ورلڈ کپ کا آغاز کرنے کی تجویز دی جس کو ۱۹۶۹ء میں قبول کر لیا گیا۔

پاکستان کی ہاکی کا زوال اچانک رونما ہونے والا سانحہ نہیں بلکہ اِس نے ہر آنے والی حکومت کے رنگ و دھوپ سہے ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۹۴ء تک کے اِس سفر میں بہت سے پیچ و خم آئے۔ سب سے پہلی بڑی شکست ۱۹۸۶ء میں دیکھی گئی جب پاکستان کو ورلڈ کپ ہارنے کے ساتھ ساتھ ۱۲ ٹیموں میں سے گیارہوں صف میں کھڑا ہونا پڑا۔ اِس کے فوراً بعد اُمید کی ایک کرن نظر آئی جب ۱۹۹۰ء میں ورلڈ کپ لاہور میں منعقد کرایا گیا۔ اِس بار پاکستان نمبر ۲ کی نشست پہ ٹھہرا، پر جب تک ہاکی اپنی بجھی ہوئی شمع کو دوبارہ روشن کر پاتا تب تک کرکٹ مداحوں کو اپنی طرف متوجہ کروا چکا تھا۔ میڈیا اور بڑی کمپنیوں نے بھی اپنی توجہ اور پیسہ کرکٹ کی طرف مرکوز کر دیا تھا جو کہ ان کی اپنی ترجیحات اور مرضی پر منحصر ہے۔ انکا پیسہ ہے وہ جہاں مرضی لگائیں۔

آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ پی ایچ ایف کا خود کا ایک اسٹیڈیم بھی نہیں ہے، نہ ہی یہ اتنا منافع کما سکتا ہے کہ اپنے اخراجات خود اُٹھا سکے۔ جس کے لئے اسے حکومت کی طرف نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ۲۰۱۴ء ورلڈ کپ میں شکست اور ۲۰۱۶ء ریو اولمپکس کی قابلیت پر پورا نہ اترنے کے بعد کیپٹن محمد عمران نے بیان دیا کہ " کوئی نان چنے پہ گزارا کرنے والی ٹیم سے عالمی سطح پر جیتنے کی امید کیسے کر سکتا ہے"۔ اِن کا یہ بیان محض اس چیز کا ترجمان نہیں کہ ہاکی کے کھلاڑیوں کے پاس کھانے کی کمی ہے بلکہ یہ اِس بات کی عکاسی بھی کرتا ہے کہ ہاکی کو دوبارہ سے عالمی سطح پر اُٹھانے کے لئے حکومت کی لگن اور مہارت کاروں کی انتھک محنت کی ضرورت ہے۔ میں یہ بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ پی ایچ ایف کو نوجوان نسل میں سے نئے ہاکی ٹیلنٹ کو اُبھارنے میں اہم کردار ادا کرنا چاہئے تھا پر اب تک تو یہ کھیل ہمارے اسکولوں کالجوں اور گلی محلوں کے گراؤنڈ سے بالکل غائب ہو چکا ہے۔ ہر ٹورنمنٹ کی شکست کے بعد پی ایچ ایف کی طرف سے اعلان سننے میں ملتے ہیں کہ اب ہم اپنے پلان میں یہ تبدیلی کریں گے جس سے مستقبل میں فلاں کامیابی حاصل ہوگی پر یہ باتیں اِس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ہاکی فیڈریشن کے پاس ایک مستحکم سوچ اور حکمتِ عملی کی کمی ہے۔ ہاکی پاکستان کے فخر اور جوش و خروش کی علامت سمجھا جاتا تھا، جو صرف نام کا قومی کھیل رہ گیا ہے۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ آج صرف ہاکی ہی نہیں، اِس کے ساتھ ساتھ اور بہت سے کھیل مہارت کاروں کی کمی کی وجہ سے زوال کا شکار ہو چکے ہیں۔ اِس کے علاوہ بیشتر

کھلاڑیوں نے یہ قبول کیا ہے کہ جتنا انعام انہیں دینے کا اعلان کیا جاتا ہے اس کے برابر اِنھیں کبھی نہیں نوازا گیا۔ اِن کھیلوں کے نامور اور فاتح ستاروں کو صرف سیاست دان اپنے دفتر کی دیواروں پر سجانے کا کام لیتے آئے ہیں۔ ان کو کوئی ماہرِ غذائیت، فیزیوتھیراپسٹ، فیزیکل ٹرینر، ویڈیو اینیلسٹ میسّر نہیں۔ ہاں! ایک ڈاکٹر اِن کے لئے مقرر ہے جس کا کردار میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ اس صورتحال کا سامنا ہمارے کھلاڑیوں کو قومی سطح پر کرنا پڑ رہا ہے تو سوچئے عالمی سطح پہ ہمارے کھلاڑی کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ہاکی میں نئے ٹیلنٹ کو نہ وہ مواقع مل سکے اور نہ ہی پہلے سے موجود کھلاڑیوں کی فنی مہارتوں کو بدلتے ہوئے کھیل کی تکنیکی مہارتوں سے مذین کرایا گیا۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ ہر ٹورنمنٹ کے بعد کوچ تبدیل کروا دیے جاتے ہیں اور ہر کوچ کے کھیل کے مختلف داؤ پیچ کھلاڑی اتنا جلدی سیکھ نہیں پاتے۔ اِن سب حالات کے باوجود یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ ہمارے ہاکی کے ستارے اِن مشکلات کے باوجود کچھ میڈل اپنے نام کر گئے ہیں جن میں ایشین گیمز کا سلور میڈل اور ۲۰۱۲ء اور ۲۰۱۳ء کی ایشین چیمپین ٹرافی شامل ہے۔ میرے لئے یہ کھلاڑی آج بھی باعثِ فخر ہیں جنھوں نے قومی کھیل کو ڈوبنے سے بچایا ہوا ہے۔

اگر ہم ماضی میں جھانکیں تو وہ دور بھی تھا جب پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن اور حبیب بنک بھی کھیلوں کو فروغ دیتے تھے ان کی کھلاڑیوں کی ٹیم ہوتی تھی جن کے گھر کی روزی روٹی بھی چلتی تھی اور کھیل کو بھی فروغ ملتا تھا لیکن پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن خسارے میں جانے لگی اور کھیل کی ٹیم بھی اسی کی نظر ہو گئی۔ حبیب بینک پرائیویٹ ہو گیا۔ ہمارے تمام کھیلوں کے ساتھ یہ ہی ہوا کبھی اسکواش، سنوکر، کبڈی اور ٹیبل ٹینس نے بھی عروج دیکھا تھا اب کھیل کے میدان کچرے کے ڈھیر بن گئے ہیں۔ اگر یہ ہی حالات رہے تو کہیں یہ نہ ہو کہ اگلے ۷۰ سالوں میں ہمارا قومی کھیل ہی تبدیل ہو جائے جو کہ شاید کوئی موبائل گیم ہو۔

مضنفہ انڈو یجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں۔
info@individualland.com

میری کاوش رنگ لائے گی

تحریر: سندس سیدہ

گلگت بلتستان کی ایک خوبصورت وادی ہنزہ جس کی خواندگی کی شرح ۹۰ فیصد سے بھی زیادہ ہے اس شہر کے ایک بچے نے جس زمانے میں اسکول جانے کا سوچا اس وقت بہت کم لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اسکول جانے کے لیے انہوں نے اپنی ماں اور دادی کی مدد سے اپنے والد سے سفارش کروائی اور اسکول جانے کی اجازت لی۔ وہ کئی کلو میٹر پیدل چل کر اسکول جاتا۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد علم حاصل کرنے کی لگن ان کو کراچی لے گئی جہاں نوکری بھی کی اور ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی۔ وظیفہ پر ایران سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، تعلیم حاصل کرنے اور نوکری کے اس سفر میں اپنے علاقے کی بہتری کے لیے جدوجہد کرنا کبھی نہیں بھولے تھے۔ ڈاکٹر شیر زمان نے اپنے بارے میں بتایا کہ انہوں نے گلگت بلتستان کے لوگوں کو حقوق دلوانے کے لیے جوانی کے دور میں ہی بھٹو کے سامنے مطالبات پیش کیے۔ یعنی کہ وہ جوانی سے اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ ان کی کاوش ہر دور میں جاری رہیں اور اب تک جاری ہیں چاہے وہ جمہوریت کا دور ہو یا آمریت کا دور۔ اپنی نوکری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اپنی سرکاری نوکری کا آغاز انہوں نے انیسویں گریڈ، اسٹیبلشمنٹ ڈویژن سے کیا اور وہ بیسویں گریڈ پر ریٹائرڈ ہو گئے۔ بچپن گیا جوانی آئی اور پھر وہ بھی ڈھل گئی اور اب تک گلگت بلتستان کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ وہ گلگت بلتستان کے لوگوں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے آج بھی خطوط لکھتے ہیں ان کے بے شمار سوالات ہیں، ان کا کہنا ہے کہ آج تک انہیں ان سوالوں کا جوابات نہیں دیے گئے۔ اب جبکہ پاکستان میں پاک چائنہ اقتصادی راہداری بن رہی ہے اور اس علاقے کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے ان کے چند سوالات اس حوالے سے بھی ہیں لیکن کوئی جواب دینے والا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے سوالات آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گی۔

۱۔ اگر گلگت بلتستان کو کشمیر کے مہاراجہ سے آزاد نہ کروایا جاتا تو خدانا خواستہ یہاں بھی بھارتی تسلط قائم ہوتا تو پاکستان کا چین سے کوئی تعلق نہ ہوتا؟
۲۔ اگر یہ علاقہ پاکستان میں نہ ہوتا تو بھارت دوسرے دریاؤں کی طرح دریائے سندھ کو بھی بند کر دیتا، اس صورتحال میں پاکستان کے کیا حالات ہوتے؟
۳۔ چائنہ پاکستان راہداری کا کوئی منصوبہ ممکن نہ ہوتا۔ گلگت بلتستان اس راہداری کا دروازہ ہے، مگر افسوس کہ یہاں کے لوگوں کا اس منصوبے سے کوئی عمل دخل نہیں ہے۔
۴۔ یہاں کے غیور عوام ۴۸۔۱۹۴۷ء سے پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں، جس میں سیاہ چن اور کارگل سرِ فہرست ہیں۔
۵۔ افسوس ہے کہ یہاں کے شہیدوں، جفاکش عوام کو سیاسی اور انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ کیا یہ نظر اندازی اور حق تلفی ہی یہاں کی عوام کی قربانیوں کا صلہ ہے؟

میں خود کو ڈاکٹر صاحب کے سوالات کے جواب دینے کے قابل تو نہیں سمجھتی لیکن میرے ذہن میں یہ سوالات سن کر بے شمار مزید سوالات گردش کرنے لگے جیسے کہ: اگر گلگت بلتستان کا علاقہ آزاد نہ ہوا ہوتا تو کیا ہم سیاحت کے خوبصورت مقامات سے محروم رہتے، افواج کے پہرے وہاں پر بھی بٹھانے پڑتے اور لائن آف کنٹرول پر جو حالات ہیں وہاں پر بھی ہوتے؟ اگر بھارت دریائے سندھ کو بھی بند کر دیتا تو سندھ کی عوام جو پہلے ہی قطرے قطرے کو ترس رہی ہے وہ تھر کی طرح خشک ہو جاتی؟ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے لیکن کیا گلگت بلتستان کے علاقے کا پاکستان کا حصہ ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوا کہ چین ہمارے پاس خود آ رہا ہے؟ جہاں تک بات ہے عوام کی سرحدوں کی حفاظت کرنے کی تو میرے خیال میں یہ عوام کا کام نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ چائنہ بلاوجہ اربوں ڈالروں کی سرمایہ کاری نہیں کر رہا۔ اگر گلگت بلتستان پاکستان کا حصہ نا ہوتا تو پاک چائنہ اقتصادی راہداری پاکستان تک کیسے پہنچتی؟ خنجراب کا علاقہ چائنہ اور گلگت بلتستان کے بارڈر پر واقع ہے اور کوریڈور کا آغاز اس علاقے سے ہونا ہے لیکن نا تو پارلیمنٹ میں اس علاقے کی نمائندگی ہے اور نہ ہی کسی اجلاس میں ان کو بلایا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس راہداری سے علاقہ میں ترقی کے نئے دروازے کھلیں گے لیکن کیا اس ترقی کے لیے بھی علاقے کے لوگوں کو خود تگ و دو کرنا ہوگی؟

گلگت بلتستان میں آزاد کشمیر اور انڈیا دونوں کو اپنا اپنا مفاد دیکھائی دیتا ہے۔ ہر کوئی اسکو اپنا حصہ بنانا چاہتا ہے۔ لیکن دوسری جانب اس علاقے کے لوگ جس کا حصہ بننا چاہ رہے ہیں وہ اس سے سوتیلوں جیسا سلوک کر رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ۱۹۴۸ء میں اس علاقے کی عوام نے جب کشمیر کے راجہ سے جنگ کر کے اپنے خطے کا قبضہ چھڑایا تھا اور رضا کارانہ طور پر پاکستان کیساتھ شمولیت کا اعلان کیا تھا اس فیصلے پر ان کو پچھتاوا ہونا شروع ہو جائے اور وہ باغی ہو کر کوئی غلط قدم اٹھالیں۔ کبھی کبھار خبریں سننے کو ملتی ہیں کہ گلگت بلتستان کو صوبے کا درجہ دینے پر غور شروع کر دیا گیا ہے۔ شاید یہ غور کرنے کی بھی نوبت نہ آتی اگر چائنہ پاک اقتصادی راہداری نے گلگت کے علاقے سے شروع نہ ہونا ہوتا۔ اگر جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو اسکے بارڈرز افغانستان، وسط ایشیاء، چین اور بھارت کیساتھ لگتے ہیں۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ کے ٹو کی بیس، کارگل اور سیاچن اس علاقے میں ہیں۔ پھر بھی اس علاقے کی حیثیت متنازعہ ہے جبکہ اٹھارویں ترمیم کی بات کی جائے تو ایسا محسوس ہوگا جیسے یہ محض ترمیم نہیں باقاعدہ ایک دستور ہے جس میں ۱۹۷۳ء کا آئین پرو دیا گیا۔ لیکن دوسری جانب گلگت بلتستان کو صوبے کا آئینی درجہ دینے کے مطالبے پر حکمرانوں کے سروں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ علاقہ پاکستان کے اور بین الاقوامی قوانین کے بیچ پس کر رہ گیا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آئینی طور پر کچھ ناانصافیاں ان کے ساتھ ہوتی رہتی ہیں پھر بھی گلگت بلتستان کے لیڈران اور عوام نے پاکستان سے علیحدہ ہونے کا نہیں سوچا۔ گلگت بلتستان میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ موجود ہے، لیکن اسمبلیوں اور سینٹ میں نمائندگی نہیں دی جاتی ۔ یہ صورتحال ہو تو یہ سوال بجا ہے کہ آخر ذہنی طور پر ترقی یافتہ لوگوں اور ایک پڑھے لکھے علاقے کو کتنی دیر تک انکے حقوق سے محروم رکھا جا سکتا ہے؟

آخر میں بس یہی کہ مجھے اب بھی امید ہے کہ فاٹا ریفارمز کے بعد اب گلگت بلتستان ریفارمز کی باری بھی جلد آئے گی۔ تاکہ ۷۰ سال ان لوگوں نے بنیادی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں جو وقت گزارا وہ رائیگاں نہ جائے۔ جب پاکستان ۱۴۰ سال کا ہو جائے گا تو ہم فخر سے بتا سکیں گے کہ ۷۰ سال پہلے والی باتیں اب نہیں رہیں ہماری کاوشیں رنگ لے آئی ہیں ہم ترقی یافتہ ملک کے ایک اہم صوبے کے شہری ہیں جن کو تمام حقوق حاصل ہیں۔

مصنفہ انڈیویجول لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں۔
info@individualland.com

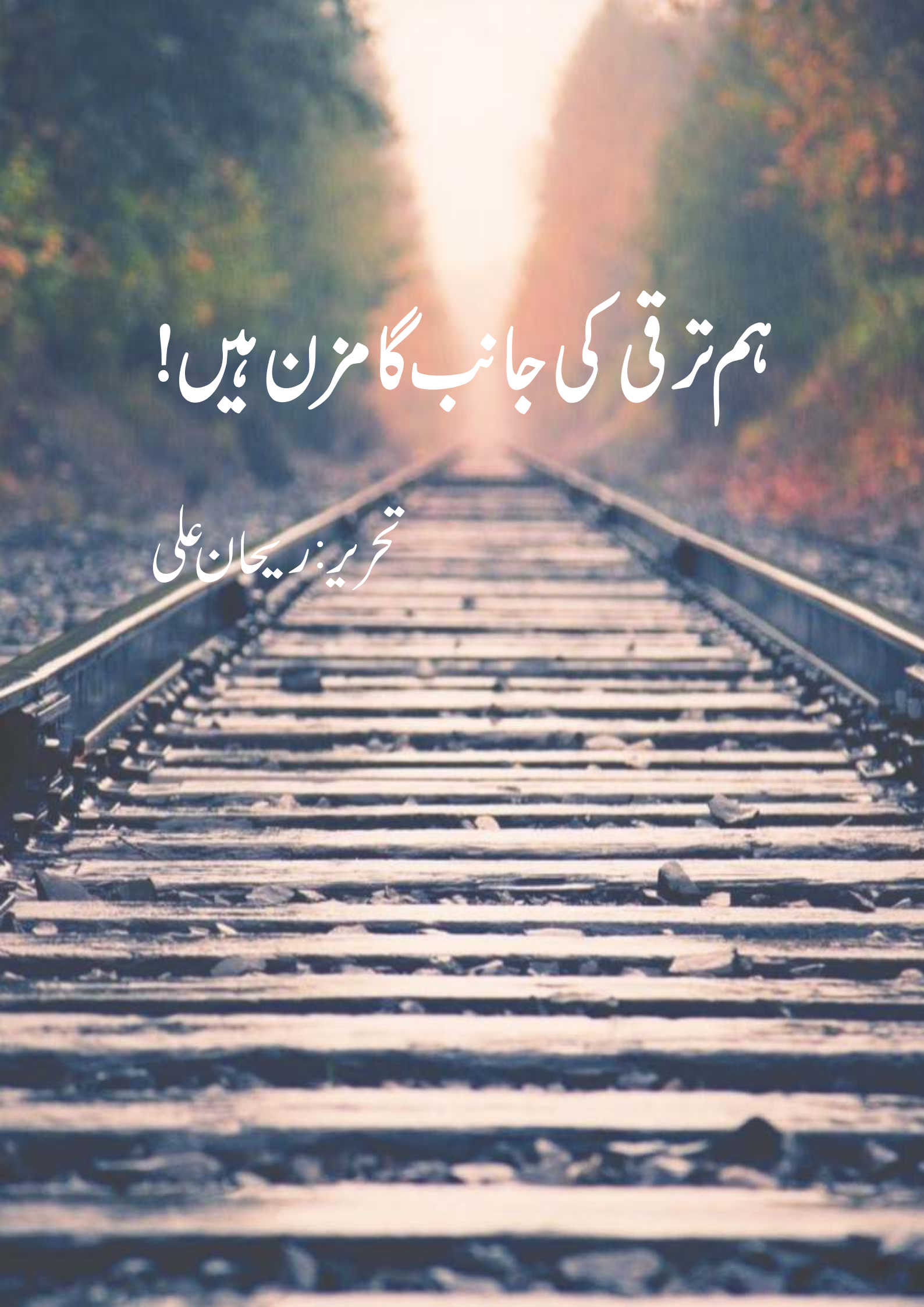

ہم ترقی کی جانب گامزن ہیں!

تحریر: ریحان علی

جی ہاں! رفتہ رفتہ ہی سہی لیکن ہم ترقی کی جانب گامزن ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت پاکستان کو جو علاقے وراثت میں ملے وہ اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے۔ اگر زرائع آمدوفت کی بات کی جائے تو اسکا حال ہم جانتے ہیں، سڑکوں اور ریل نیٹ ورک اور توانائی کے ڈھانچے کے بارے میں ہم کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں وراثت میں ملنے والا وسیع نہری نظام تھا جو آج بھی استعمال میں ہے اور جو ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لیکن ان تمام وسیع وعریض نظام سے لے کر غیر مناسب لیکن چلتے ہوئے زرائع آمدورفت کی بات کی جائے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہماری ریڑھ کی ہڈی ابھی سے گھس چکی ہے۔ اگر اب بھی مناسب خوراک فراہم نہ کی گئی تو یقیناً یہ جسم کو مفلوج بنادے گی کیونکہ تمام جسم کا دارومدار اس پر ہے۔ ڈیمز میں شامل ہیں بڑے ہائیڈرو الیکٹرک ڈیمز جن سے بجلی بنتی ہے، چھوٹے ڈیمز جن سے بجلی کی تھوڑی مقدار پیدا ہوتی ہے اور بیراج جو بجلی پیدا نہیں کرتے لیکن زراعت اور گھروں میں استعمال کے لیے پانی سٹور کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ انگریز چلے گئے ہمارے لیے یہ نظام ہی نہیں بلکہ ان کی حفاظت کے کتابچے بھی چھوڑ کر گئے کیا ہم ان کتابچوں کے مطابق ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں؟ کیا نئے بنانے والے ڈیم کافی ہیں؟ کیا اب بھی ہم اسی آسرے پر زندگی گزاریں گے کہ ڈیم سے بجلی پیدا کریں؟ کیا سورج اور ہوا جیسی نعمتوں پر ہم اب بھی آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہیں گے اور مستفید ہونے کا کوئی منصوبہ نہیں بنانا چاہتے؟ ڈیم کا نظام شاید ملک میں سب سے متنازعہ جزو ہے۔ پاکستان نے دو بڑے ڈیم منگلہ اور تربیلا ڈیم تعمیر کیے ہیں جو ایک گیگا واٹ کی بجلی پیدا کرتے ہیں البتہ اور ڈیموں کی تعمیر کئی وجوہات کی بنا پر روکی ہوئی ہے۔ منگلہ ڈیم اور تربیلا ڈیم آج بھی کام کر رہے ہیں اور پاکستان میں بجلی جو استعمال ہوتی ہے وہ ان دونوں ڈیموں سے آتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابھی اور ڈیمز بنانے کی صلاحیت موجود ہے۔ کالا باغ ڈیم کے نہ بننے کی وجہ ہے کہ سب صوبوں کو برابر پانی نہیں ملے گا، کیا ہمارے پاس کالا باغ ڈیم ہی ایک حل ہے کوئی نیلا، پیلا، سبز باغ کیوں نہیں ہوسکتا؟ یا سبز باغ بس دکھانے کے لیے ہی ہیں؟

کیا کسان خوشحال ہے، کیا مناسب مقدار میں بجلی پیدا کی جارہی ہے؟ کیا ڈیم کی ضرورت ابھی بھی نہیں محسوس کی جارہی ہے؟ یا زیرزمین پانی کے بھی ختم ہونے کا انتظار کیا جارہا ہے؟ کسی بھی معاشرے کے افراد کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کو ریاست کی جانب سے بنیادی سہولیات فراہم کی جائیں۔ کیا پانی ہماری بنیادی سہولیات میں نہیں آتا؟ پھر اس پر توجہ کیوں نہیں دی جارہی؟ تھر یا چولستان کی نہیں کراچی کی بات کرنا چاہوں گا، کیا کراچی میں صاف پانی کے لیے لوگوں کو مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا؟ کیا اب یہ حالات ہیں کہ پانی تک بھی ایک خاص طبقے کی رسائی ہوگی؟

تقریباً ۷۰ سال پہلے جو بنیادی ڈھانچہ موجود تھا پاکستان نے اس سے زیادہ وسیع تر بنیادی ڈھانچہ بنایا ہے لیکن اگر ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ موازنہ کریں تو ابھی بھی پیچھے ہیں۔ پاکستان میں بنیادی ڈھانچے کے دو اہم اجزاء ٹرانسپورٹ کا نظام اور ڈیم کا نظام ہیں۔ ٹرانسپورٹ میں شامل ہے سڑکیں، ریل اور ایرلنکس جب کہ ڈیمز کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد سب سے زیادہ سرمایہ کاری سڑک کے نظام پر دیکھی گئی ہے۔ کافی تعداد میں ہائی ویز تعمیر کیے گئے ہیں جو ملک کے شہروں کو آپس میں ملاتے ہیں، جس میں نیشنل ہائی وے این ۵ کراچی تورخم، نیشنل ہائی وے ۱۰ کراچی گوادر شامل ہیں۔ ان ہائی ویز کی حد ۱۸ کلومیٹر سے لے کر ۱۸۰۰ کلومیٹر تک ہے۔ اس سڑک کے نظام نے سامان کی نقل وحرکت اور بس کے زریعے لوگوں کی نقل وحرکت کو آسان بنادیا ہے۔ عام شہریوں کے لیے ہسپتالوں، اسکول، کالج یونیورسٹیوں کا سفر آسان ہوگیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسکول اور ہسپتال تک پہنچنے کے بعد کن مسائل اور وسائل کے فقدان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خوراک ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا نہایت آسان ہو چکا ہے یہ الگ بات ہے کہ ذخیرہ کرنے اور کاٹنے تک کے مسائل نئے دور کے نئے تقاضوں کی طرح تبدیل ہوتے جارہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مسافتیں تو کم ہو گئیں ہیں لیکن غیر مناسب فنڈ کی تقسیم اور بنیادی سہولیات پر توجہ نہ دیے جانے کی وجہ سے دلوں کے فاصلے کچھ زیادہ ہوگئے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جہاں ہسپتال چاہیئے تھے وہاں شاپنگ مال بنائے جارہے ہیں اور جہاں سڑک چاہیئے تھی وہاں اسکول تعمیر کیے جارہے ہیں۔ یا پھر اسکولوں کو نظرانداز کر کے پل بنادیے گئے اور کبھی بنیادی سہولیات کے لیے ترستے لوگوں کو ڈیموں کے خواب دکھائے جارہے ہیں۔ پاکستان میں شاید ریل سسٹم کو سب سے زیادہ نظرانداز کیا گیا ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے ریل نیٹورک میں کوئی نئے اضافے نہیں کیے گئے۔ ہاں ٹرین کچھ جدید اور سہولیات سے آراستہ ہوگئیں ہیں۔ پہلے کوئلے کے انجن پر دارومدار ہوتا تھا جو کہ اب تبدیل ہوکر نئے انجن آگئے ہیں۔ دیگر ممالک میں ذرائع آمدورفت کے بہترین نظام ہوتے ہیں اور میلوں کی مسافت چند منٹوں میں طے ہوجاتی ہے لیکن ہمارے ہاں ایک میٹرو یا اورنج لائن ہزاروں مشکلات کے بعد بن پاتی ہے۔ جب وہ بن جاتی ہے تو کسی ایک سانحہ کے رونما ہوجانے سے بجائے اسکے کہ اس سہولت کا استعمال کیا جائے لوگ اس سہولت تو

جلاتے ہیں اور اپنے ہی پیسوں سے بنی املاک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ سڑک کے نظام کے بعد ہوائی نظام میں بھی بہتری آئی ہے۔ نئے راستے بنائے گئے ہیں اور نئے مقامی کیریئرز قائم کیے گئے ہیں جس میں ائیر بلیو اور شاہین شامل ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پی آئی اے ان مقامات پر پرواز کرتی ہے جہاں سے منافع حاصل نہیں ہوتا جو ایک نجی کیریئر کبھی نہیں کرے گا۔ لیکن یاد رہے جب ہم نجکاری کی بات کرتے ہیں تو وہاں منافع کی بات بھی ہوتی ہے۔ پی آئی اے ابھی تک چل رہی ہے یہ ہماری خوش قسمتی ہے ورنہ ہم اپنے اداروں کے ساتھ کتنے مخلص ہیں اس کا اندازہ آئے روز کرپشن کی خبروں سے لگایا جا سکتا ہے۔

بہر حال پاکستان کچھوے کی رفتار سے ہی سہی لیکن ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ اسی طرح اگر پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن رہا تو اگلے ۷۰ سال میں پاکستان ایک ترقی یافتہ ملک کہلائے گا۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان مین پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں:
info@individualland.com

اقلیتی برادری کے ساتھ بیتے لمحات

تحریر: انعم باسط

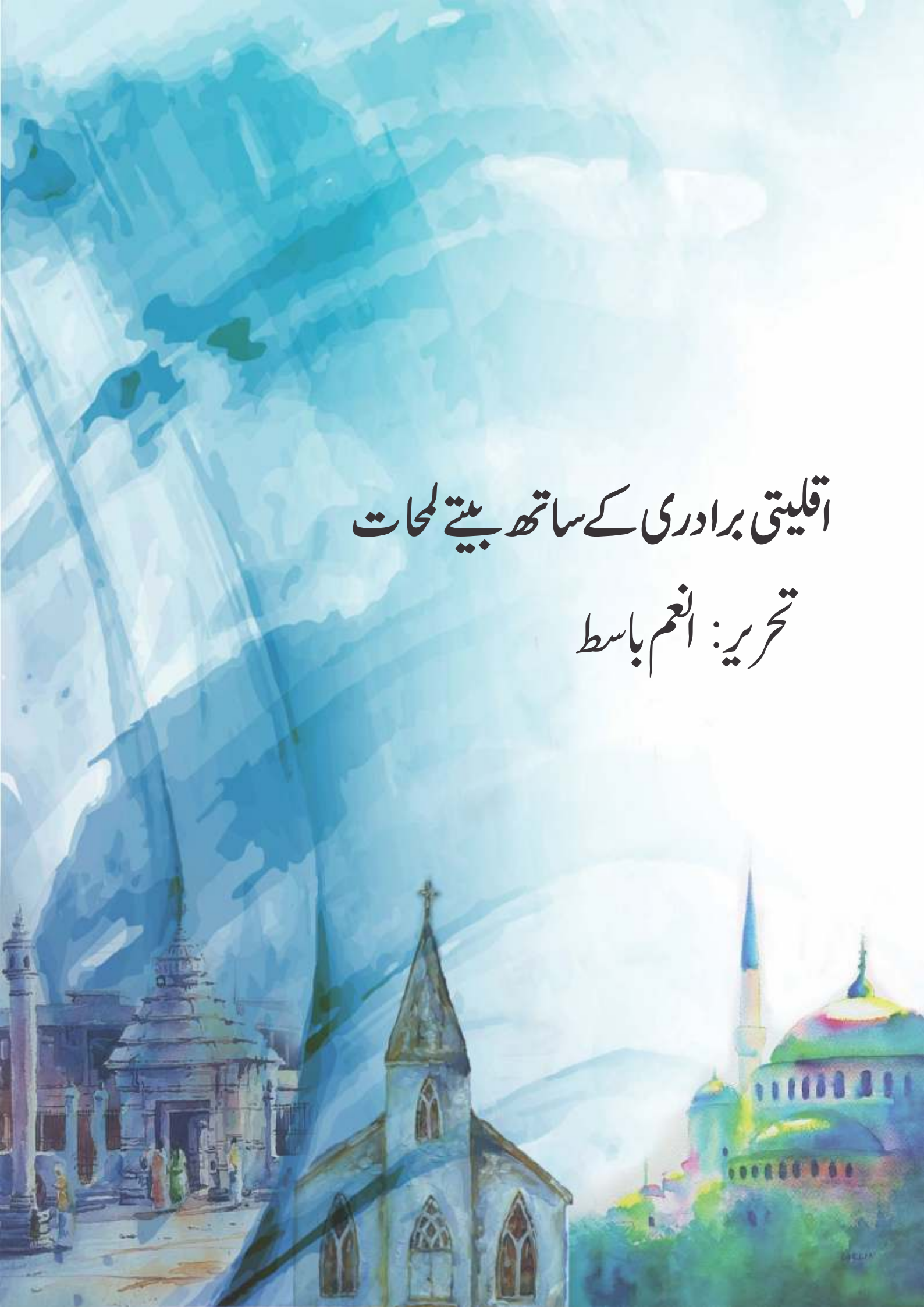

مردان میں پیش آنے والے واقعے نے ہر جانب ایک ہلچل مچادی۔ بلاشبہ نہ ہی ہمارا قانون کسی کو شک کی بنا پر مارنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی قانون کو ہاتھ میں لے کر اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ توہین رسالت کا قانون ایسا قانون ہے جس پر عدلیہ کو جلد از جلد فیصلے سنانے چاہییں۔ جب ایسے کیسز کے فیصلے التوا کا شکار ہوتے ہیں تو لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ انہیں انصاف نہیں مل رہا اور عدلیہ درست کام نہیں کر رہی۔ اس ملک میں صرف اقلیتی برادری ہی غیر محفوظ نہیں ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بطور ایک شہری کے ہر ایک شخص غیر محفوظ ہوسکتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہماری حفاظت کے لیے قوانین موجود نہیں ہیں قوانین کے موجود ہوتے ہوئے یہ کام ہو رہا ہے اور ہم سے ہمارے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔ اگر اقلیتی برادری کی بات کریں تو ان کے بارے میں آئے روز آنے والی خبروں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک شہری ہونے کے ناطے شاید اکثریت سے زیادہ غیر محفوظ ہیں۔ جب پچھلے دنوں مجھے دفتر کے کام کے سلسلے میں لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں میں کچھ نئے لوگوں سے ملی اور اِن سے پاکستان کے مسائل پر بات کر کے ایک منفرد اور مثبت پہلو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ انٹرنیٹ اور اخبارات کی دنیا میں گھومنے سے بہتر ہے کہ ہم لوگوں سے ملیں اور اِن کے تجربات سے سیکھنے کو ترجیح دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ پاکستان میں بسنے والی اقلیتوں کو بہت سی مشکلات اور تکالیف کا سامنا ہے اور اگر میں اِن پہ لکھنے بیٹھوں تو شاید اِس عنوان کے لئے صفحات کم پڑ جائیں گے۔ پھر میں نے خود سے سوال کیا کہ ہم ہمیشہ منفی سوچ کی عینک پہن کر ہی کیوں کسی بھی پہلو کو دیکھتے ہیں۔ ہمیں اپنے مسائل سے نمٹنے کے لئے ایک مثبت سوچ کی ضرورت ہے۔ یہی منفرد سوچ لئے خوشگوار موڈ میں ہم دفتر کے ساتھیوں نے کچھ کمیونٹی بیسڈ آرگنائزیشنز کے افراد کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا جہاں مسیحی برادری کے افراد کے ساتھ بات کرنے کا موقع ملا۔

کھانے کی میز پہ موجود تمام لوگوں کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اِن میں سے اقلیت کون ہے اور اکثریت کون ہے۔ اتنے اچھے ماحول میں میرے دماغ میں جتنے سوالات تھے ان کے جواب جاننے کی حسرت مزید بڑھ گئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں سے سوال کیا کہ آپکے خیال میں حکومت اقلیتی برادری کے حقوق کے لئے کیا اقدامات کر رہی ہے؟ اِس پر مِس رضیہ نے جواب دیا کہ سب سے خوش آئند بات یہ ہے کہ اب حکومت نے نوکری کا کوٹہ بڑھا کر ۲ فیصد سے ۵ فیصد تک کر دیا ہے۔ پہلے صفائی کے کام کو صرف مسیحی برادری کیلئے رکھا جاتا تھا پر اب یہ سوچ اور عمل بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ اُن کا مزید یہ کہنا تھا کہ اگر ہمیں ترقی کی اس دوڑ میں آگے بڑھنا ہے تو اس کے لئے ہمیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ انہوں نے بتایا کہ اب گورنمنٹ کے اسکولوں کے نصاب میں بھی تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ پہلے ہمارے بچے اسکول میں اپنے آپ کو دوسرے بچوں سے الگ اور تنہا محسوس کرتے تھے پر اب اِس صورتحال میں بھی مثبت تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ پنجاب حکومت نے ایک اہم اقدام اٹھایا ہے جس کے ذریعے ان طبقات تک تعلیم کی رسائی ممکن بنائی جائے گی جن کے علاقے میں گورنمنٹ اسکول نہ ہوں یا جن کی رسائی تعلیم تک مشکل ہو۔ اِس پروگرام کو سراہتے ہوئے مِس رضیہ نے یہ بھی بتایا کہ اِس مہم کے تحت وہ خود اپنے گھر میں اقلیتی برادری کے بچوں کے لئے اسکول چلا رہی ہیں جس میں پنجاب گورنمنٹ انہیں مالی معاونت فراہم کر رہی ہے۔ رومیل رائے جو کے کرسچین میڈیا سروسز اِدارے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے گورنمنٹ کے مثبت کردار پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ حکومت نے ہمیں ملکی سطح پر سینیٹ میں ہمارے نمائندوں کو نشست دی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اب اقلیتی برادری کی نشستیں قومی اور صوبائی اسمبلی میں بھی ہیں۔ اب اِن کا کردار یہ ہونا چاہئے کہ اپنی نشست کا جائز استعمال کرتے ہوئے ہمارے لئے بہتری کی راہ ہموار کریں۔ انہوں نے ہندو میرج بل پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اِس بل کو پاس کرانے میں سندھ اسمبلی کا بہت عمل دخل ہے۔ ہماری ہندو برادری کے لئے جو کہ پاکستان میں بسنے والی دوسری بڑی اقلیتی برادری ہے، اِن کے لئے ایک خوش آئند خبر ہے۔ اب ہندوؤں کے ساتھ ساتھ سِکھ بھی اپنی شادی پاکستانی قانون کے مطابق رجسٹر کرواسکیں گے۔ اِس طرح کے اقدام زبردستی مسلمان کر کے کی جانے والی شادیوں کی روک تھام کا پیش خیمہ ہیں۔ سندھ وہ صوبہ ہے جس نے سب سے زیادہ ہندو اور سکھ برادری کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ ۲۰۱۱ء کے سیلاب سے سب سے زیادہ صوبہ سندھ کو نقصان پہنچا تھا۔ جس پر صدر ہندو پنچایت نے خود اعتراف کیا تھا کہ گورنمنٹ اور عام عوام سب نے مل کر سیلاب کی تباہ کاری میں ہماری مدد کی ہے۔ ہماری مدد کرنے میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں کو غیبی امداد بھی پہنچی جس کے بھیجنے والے کا کوئی پتہ نہ تھا۔

دوسرا بڑا اقدام جو حکومت کی طرف سے لیا گیا اُس میں اقلیتی گھرانوں کو بطور تحائف نقدی دینے کا ہے۔ چاہے ہولی ہو یا کرسمس، دیوالی ہو یا ایسٹر گورنمنٹ کی طرف سے ہر خاندان کو پانچ ہزار روپے نقد دیے جاتے ہیں۔ دوسری ہی جانب اخوت نامی ایک ادارے نے گورنمنٹ کے تعاون سے رواں سال ایسٹر کے موقع پر پچاس ہزار سے لے کر

ایک لاکھ تک کا قرضہ دینے کا اعلان کیا ہے جو کہ کرسمس کے موقع پر بھی دیا جائے گا۔ رومیل صاحب نے یہ بھی بتایا کہ یوحنا آباد کے تکلیف دہ سانحے کے بعد گورنمنٹ نے خود امن پہ کام کرنے والے اداروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اپیل کی ہے۔ جس کے تحت کمیونٹی کے تمام پُر اثر افراد کو ایک جگہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اِن میں علماء حضرات، استاد، مولانا صاحب، اور پادری صاحب کو شامل رکھا جاتا۔ پھر ان سے معاشرے اور خاص کر کے اِن کے علاقے میں امن قائم کرنے کے طریقہ کار اور اِن کے پُر اثر کردار کو بروئے کار لانے پر بات کی جاتی۔ رومیل صاحب کا کہنا تھا کہ ایسی ملاقات کے ثمر بھی محسوس کیے گئے ہیں کیوں کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر امن کی فضا میں رہنا چاہتے ہیں۔

میرا اگلا سوال یہ تھا کہ کیا واقعی اب ہم کوئی مثبت تبدیلی دیکھ سکتے ہیں؟ کیوں کہ جتنے بھی حقوق کو محفوظ کرنے والے قوانین کیوں نہ بنالیں جب تک معاشرے میں اقلیتوں کے لیے قبولیت کی حِس بیدار نہیں ہوگی تب تک کسی بھی قانون پر مکمل عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اِس بات پر آفتاب صاحب کا نقطۂ نظر بہت اہم تھا۔ آفتاب صاحب کا تعلق گیان فاؤنڈیشن سے ہے۔ اُن کے بقول وہ بھی وقت تھا جب کچھ ہوٹلوں میں اقلیتی برادری کے لیے الگ کھانے کے برتن رکھے جاتے تھے جو کہ اب نہیں ہوتا۔ اُن کے خیال میں معاشرے کی سوچ کو بدلنے میں حکومت اور انسانی حقوق پر کام کرنے والے اِداروں کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ جیسے کہ بیشتر سیاسی لیڈروں کا ہندوؤں اور مسیحی برادری کے تہواروں میں شرکت کرنا اور ایسے مواقعوں پر اظہارِ یکجہتی کا پیغام دینا۔ یہ سب اِس بات کی دلیل ہے کہ پاکستان کی حکومت اقلیت کو بھی پاکستانی قوم کا حصہ سمجھتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں سمجھتی ہوں قومی ہم آہنگی بڑھانے اور اقلیتی برادری کے حقوق دلانے میں میڈیا کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ ٹیلی ویژن پر ایسے ٹاک شوز اور پروگرام چلائے گئے جن میں سب برادریوں کو اکٹھا لایا گیا اور ان کے مسائل کے حل پہ بات کی گئی۔ ایسے پروگرام نشر کیے گئے جن کے ذریعے ہم آہنگی اور ایک ہونے کے پیغام کو عام کیا گیا۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مِس نورین نے کہا کہ ہم تہواروں کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔ مس نورین جو کہ کرسچین میڈیا سروسز کے ساتھ منسلک ہیں، چاہتی ہیں کہ اپنا پیس (امن) سینٹر بنائیں جو کہ اقلیتی برادری کے مسائل پر اور ان کو بہتری کی جانب لے کے جانے پر کام کر سکے۔ اِن کے بقول ایسے سینٹر ہر ضلع میں قائم ہونے چاہیں۔ رواں سال ہی پاکستان نیشنل آرٹ کونسل میں بھی ہولی کے تہوار کا انعقاد کیا گیا جس میں قومی ہم آہنگی اور مذہبی امور کے وزیر کے ساتھ ساتھ بیشتر پارلیمنٹ کے اراکین اور ہندو لیڈروں نے شرکت کی تھی۔

معاشرے میں حکومت اور میڈیا کے مثبت اور اہم کردار کے ساتھ ساتھ کسی بھی صورت عدلیہ کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ۲۰۱۴ء میں سابق چیف جسٹس تصدق حسین نے اقلیتی برادری کے حقوق کے تحفظ کے لیے سات شرائط حکومت کے سامنے پیش کی تھیں۔ چیف جسٹس کے مطالبات میں وفاقی سطح پر ایسی حکمتِ عملی بنانے پر بات کی گئی تھی جس کے ذریعے مذہبی رواداری کو فروغ ملے، نصاب کے ذریعے مذہبی ہم آہنگی کو پھیلایا جائے، ۵ فیصد نوکریوں کا کوٹہ اقلیتی برادری کے لیے وقف کیا جائے، سوشل میڈیا پر اشتعال انگیز مواد کے خلاف نوٹس لیا جائے، اقلیتی برادری کے مال و جان کے نقصان پر فوری طور پہ کاروائی کی جائے اور ان کے لیے نیشنل کونسل بنائی جائے۔ اِن پہ کچھ حد تک عمل درآمد بھی دیکھا گیا ہے جس پر میرے ساتھ بیٹھے مہمانوں نے بات بھی کی کہ ان کو اس کے ثمرات مل رہے ہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جو کمیشن بنایا گیا ہے امید ہے وہ اہم کردار ادا کرے گا اور تقریباً ۷۰ سال ہو جانے پر اب انہیں کسی بھی مسئلے کے لیے اور اپنی آواز کو پہنچانے کے لیے کسی کا سہارا نہیں لینا پڑے گا۔ اِن سب سے بات کر کے مجھ میں بھی ایک اُمید جاگی کہ ہاں! اب حکومت کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر بھی مل جل کر رہنے کی لگن بڑھ رہی ہے۔ لیکن جب ہم معاشرے میں رویّوں کی تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو اس کے لیے طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے روّیے بننے میں بھی بہت سے عناصر اور وقت درکار ہوتا ہے۔ بلکل اِسی طرح اس میں بہتری لانے کے لیے بھی مسلسل عمل کی ضرورت ہے۔ اِس میں ہمارے ملک کی ثقافت اور فنکار بھی بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ تمام قوم کو بلا امتیاز اکٹھا کرنے کے لیے ہمارے تہوار اور ثقافتی میلوں کا انعقاد بھی بہت ضروری ہے۔ اِن میلوں اور فنکاروں کے فن کے ذریعے ہم امن کا پیغام قوم کو کوچے کوچے تک پہنچا سکتے ہیں۔ اب لوگ دیوالی اور کرسمس کے تہواروں میں بھی شرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو تمام مذاہب ہمیں اکٹھا رہنے کا درس دیتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب تفرقے کی بات نہیں کرتا۔ خدا نے جب ہمیں دنیا میں اُتارا تو ہم مسیح، ہندو یا مسلمان نہیں اُترے تھے بلکہ ہمیں انسان پیدا کیا گیا۔ تو ہم انسانیت کے ناطہ کیسے بھول سکتے ہیں جب کہ ہمارا مذہب بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
بیگزرین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں۔
info@individualland.com

انفارمیشن کمیشن کو درپیش مسائل

تحریر: سندس سیدہ

پاکستان کو معرض وجود میں آئے تقریباً ۷ دہائیاں گزر گئیں ہیں۔ ان ۷ دہائیوں میں ہم نے عوام کی سہولیات کے لیے مختلف قوانین بنائے اور کے نفاذ کو یقینی بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ان ہی قوانین میں سے ایک قانون جاننے کے حق کا بھی ہے جو کہ ہمارا آئینی حق ہے۔ اگر پنجاب کے پنجاب ٹرانسپیرنسی اینڈ رائیٹ ٹو انفارمیشن ایکٹ کی بات کریں تو اسکے کمیشن نے اپنے تین سال مکمل کر لیے ہیں اور اب نئے کمیشن کی تقرری کا وقت آ گیا ہے۔ پنجاب میں ۲۰۱۳ء کے آخر میں پہلے آرڈیننس کے طور پر اور بعد میں دسمبر ۲۰۱۳ء میں ایکٹ کے طور پر پنجاب میں جاننے کے حق کے قانون کا اطلاق ہوا۔ اس سے پہلے پنجاب میں ایسا کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ اسکو پنجاب ٹرانسپیرنسی اینڈ رائیٹ ٹو انفارمیشن ایکٹ کہتے ہیں۔ اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے نہایت ضروری تھا کہ اس کے لیے کمیشن بنایا جائے۔ کیونکہ یہ قانون کی ایک شک میں تحریر ہے کہ کمیشن تشکیل دیا جائے جو کہ اس قانون کے اطلاق کرنے لے لیے ہوگا۔ اس کمیشن کے افسران میں چیف انفارمیشن کمیشنر مظہر حسین منہاس، اور انفارمیشن کمیشنرز میں احمد رضا طاہر اور مختار احمد علی شامل تھے۔ یہ پہلا کمیشن بنا تھا اور قانون بھی نیا نیا تھا لوگ اس سے مستفید ہونا چاہتے تھے۔ جب بھی کوئی نیا قانون یا ادارہ بنتا ہے تو لوگوں کو اس سے بہت سی توقعات ہوتیں ہیں اگر سرکاری کاموں میں تاخیر ہو رہی ہو تو ہم اسکی وجوہات جاننے کی کوشش نہیں کرتے اور فوراً ادارے پر ناکام ہونے کے الزامات لگا دیتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے انفارمیشن کمشنر مختار احمد علی سے بات کی تا کہ جان سکیں کہ کمیشن کو ۳ سالوں میں کیا مشکلات درپیش رہیں۔

کمیشن کو درپیش مشکلات کے حوالے سے انفارمیشن کمشنر مختار احمد علی نے بتایا کہ پہلے کمیشن کے افسران کے طور پر ۵ مارچ ۲۰۱۴ء کو کمشنرز کو تعینات کیا گیا۔ مگر ہماری تعیناتیاں تو ہو گئیں لیکن کمیشن کو فعال بنانے کے لیے دفتر اور دیگر اشیاء کا موجود ہونا بھی ضروری تھا۔ بیٹھے کی جگہ، اسٹاف اور ضروری سامان درکار تھا۔ بجٹ چاہئے تھا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ۲ مئی ۲۰۱۴ء کو کرسی سنبھالی۔ حکومت کے ساتھ کام کرنے کا ان کا پہلا تجربہ تھا۔ کمیشن کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ میں نے سمجھا حکومت کے وہ ادارے جن کے ساتھ کمیشن منسلک ہوگا وہ ہمارا ابتدائی کام کرے گا اور جب ہمارا دفتر بن جائے گا تو ہم اس میں جا کر کام کرنا شروع کر دیں گے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ہمیں اپنی مدد آپ کے تحت کام کرنا پڑے گا۔ حکومت کے بہت سے لوگ بھی ان تمام مراحل سے واقف نہیں ہوتے کہ کس طریقے سے کوئی نیا ادارہ کام کرے گا یہ نئی بات نہیں تھی۔ لوگوں کی درخواستیں بھی موصول ہونا شروع ہو گئیں تھیں اور قانون پر عمل درآمد کے لئے بنایا گیا پنجاب انفارمیشن کمیشن وسائل کی کمی کے باعث مشکلات کا شکار تھا۔ انفارمیشن کمشنر پنجاب مختار احمد علی نے مزید بتایا کہ پنجاب انفارمیشن کمیشن کے لئے کمشنرز سمیت ۴۶ آسامیاں منظور کی گئی تھیں لیکن ان میں سے ۴۰ آسامیاں ابھی تک خالی ہیں۔ پبلک انفارمیشن آفیسرز کی ٹریننگ کے لئے بجٹ فراہم نہیں کیا گیا جبکہ قانون کی آگاہی مہم کا بجٹ بھی کم کر دیا گیا۔

ہم سے توقعات بہت زیادہ تھیں لیکن ایک کمرہ بھی نہیں تھا جس میں بیٹھ کر کام کا آغاز کیا جائے۔ کوئی کاغذ قلم یا کوئی کمپیوٹر کچھ تو ہونا چاہئے تھا جس پر کام کیا جاتا۔ ہمیں کوئی آگے بڑھنے کا اشارہ بھی نہیں دیا گیا تھا کہ اب آپ نے خود تمام کام کرنا ہے۔ کوئی ہدایات نہیں جاری کی گئیں تھیں۔ جب ہم نے کرسی سنبھالی تھی تو سالانہ بجٹ کے حوالے سے جو سمری جانی تھی وہ جا چکی تھی۔ کیونکہ جون میں بجٹ آ جاتا ہے۔ ہمارا ۲۰۱۴ء کا بجٹ آیا تھا اس میں ہمارے کمیشن کے لیے کوئی پیسہ مختص نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ تنخواہوں، آمد و رفت اور کسی بھی مد میں کوئی پیسہ نہیں رکھا گیا تھا۔ البتہ ہمارے کمشنرز کے لیے تنخواہیں رکھی گئیں تھیں۔ پھر ہم نے کمیشن کے لیے بجٹ مختص کرنے کی درخواست منظور کروائی جس کو ۲۰۱۴ء اکتوبر کے آخر میں جا کر منظور کر لیا گیا۔ بجٹ کس کس مد میں چاہئے کون سی اشیاء درکار ہیں آسامیاں کتنی ہوں گی؟ اس تمام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بجٹ بنایا گیا اور اسکو منظور کروایا گیا۔

بجٹ منظور ہونے کے بعد ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کہیں دفتر بنایا جائے۔ جس کے لیے سرکاری طور پر ایک طریقہ کار طے ہے کہ پہلے اشتہار دیا جائے گا اور پھر آنے والی درخواستوں میں سے ایک کو منتخب کیا جائے گا۔ اس عمل سے بھی ہمیں گزرنا پڑا۔ بہت سے لوگ اداروں خاص کر سرکاری اداروں کو گھر نہیں دیتے، بحر حال جون ۲۰۱۵ء تک ہم نے دفتر کے لیے عمارت بھی حاصل کر لی اور اسکے بعد ضرورت کی چیزیں بھی لے لیں۔ اسکے علاوہ سب سے اہم مسئلہ اسٹاف کا تھا جس کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہوسکتا تھا۔ دفتر کے لیے چپڑاسی اور دیگر عملہ تو تعینات کر لیا گیا لیکن اب ایک اہم مسئلہ تھا کہ ان افسران کو تعینات کیا جائے جو کہ اس قانون پر عمل درآمد کو یقینی بنائیں۔ سرکاری اداروں میں ایک سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ۱۷ گریڈ کے ایک سرکاری افسر کے پاس بھی اسٹینوگرافر موجود ہوتا ہے لیکن ہم یہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہمارے پاس تو

اسٹاف ہی موجود نہیں تھا ان پر مزید اسٹاف رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ہم نے اس حوالے سے اسٹاف کو تربیت بھی دی اور اسکول کالج میں جا کر آگاہی بھی فراہم کی۔ ان تمام صورتحال کے باوجود کمشن نے قواعد کا مسودہ تیار کر لیا، کہ کتنی لاگت لائے گی، افسران اور لوگوں کے لیے کیا ہدایات ہوں گی، کتنا جرمانہ یا سزا ہوگی۔

جب نیا نیا رائے دہی کا حق آیا تو لوگ ہم سے کافی نالاں تھے یہ جانے بغیر کہ ہم کن مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں ہمارے پاس جو درخواستیں آتی تھیں ان میں زیادہ تر غیر سرکاری تنظیمیں جو رائے دہی کے حق کے حوالے سے کام کر رہی ہیں اور صحافیوں کی آتیں تھیں۔ ہم نے کسی نہ کسی طرح نہ صرف ان درخواستوں کا جواب دیا بلکہ ہمارے پاس تقریباً ۴۰۰۰ کیس رجسٹرڈ ہوئے جن میں سے ۳۰۰۰ کیسز کا فیصلہ مکمل کر دیا گیا۔ ہم نے اپنی مدد آپ کے تحت ویب سائیٹ بنائی تا کہ لوگ وہاں سے معلومات حاصل کریں ۔لیکن اس کو برقرار نہیں رکھ سکے کیونکہ ہمارے پاس بے شمار درخواستیں تھیں لیکن کام کرنے لے لیے لوگ نہیں تھے۔ ہم نے بہت سی درخواستوں پر عمل درآمد کروایا ہے۔ جس میں گورنر ہاؤس، پنجاب پولیس کی آن لائن ایف آئی آر درج کرنے کے حوالے سے، اسمبلی کے ممبران کی حاضری ویب پر لگانے، لاہور ڈسٹرک اور سیشن جج، ای ڈی اور تعلیم کو عوام کو معلامات فراہم کرنے کے بارے میں تھیں۔

اسی سلسلے میں جرمانہ بھی کیا گیا۔ کچھ ایسے کیس تھے جن میں جرمانہ عائد کیا گیا اور متعلقہ محکمے کو لکھا گیا کہ ان افسران کو اتنا جرمانہ کیا گیا ہے لہذا ان کی تنخواہوں میں سے رقم کاٹ لی جائے۔ میرے اس سوال پر کہ جرمانے کی رقم کیا کمیشن کو ملتی ہے تو انہوں نے بتایا کہ نہیں وہ ایک مختلف محکمہ ہے اسکو جاتی ہے جہاں تمام جرمانے جمع ہوتے ہیں۔ میرے اس سوال پر کہ کیا آپکو آگاہ کیا جاتا تھا کہ جرمانہ کاٹ لیا گیا؟ تو انہوں نے بتایا نہیں ایسی کوئی معلومات موصول نہیں ہوئی کیونکہ پھر وہ افسر جس پر جرمانہ عائد کیا جاتا تھا وہ کیس آگے چلاتا تھا اور اپنا دفع کرتا تھا۔ مختار صاحب کا کہنا تھا کہ ہمارے کمیشن کے تین سال پورے ہو گئے ہیں اب اگلے کمیشن سے امید ہے کہ وہ درخواستوں کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے بہتر طور پر کام کریں گے۔ کیونکہ ان کو ہماری جیسی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ امید ہے عوام اس قانون سے مستفید ہوتی رہے گی اور نئے کمیشن کی تقرری بھی جلد ہو جائے گی، کیونکہ اگر جلد کمیشن نہ بنا اور کام نہ شروع ہوا تو لوگوں کا قوانین پر سے اعتبار بالکل اٹھ جائے گا۔

مضنفہ انڈویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں۔
info@individualland.com

ضمیمہ

مضامین کے ریفرینس:

ہندو میرج ایکٹ

https://www.usatoday.com/story/news/world/2017/02/15/pakistani-hindus-lose-daughters-forced-muslim-marriages/97013614/

http://www.worldhindunews.com/2013/11/03/11104/population-of-hindus-in-the-pakistan/

https://tribune.com.pk/story/528538/for-balochistans-hindus-there-is-a-silver-lining/?amp=1

http://www.pbs.gov.pk/sites/default/files//tables/POPULATION%20BY%20RELIGION.pdf

http://sappk.org/wp-content/uploads/publications/eng_publications/Forced_Conversion_of_Religious_Minorities.pdf

میری کاوش رنگ لائے گی

http://forpakistan.org/pakistans-beautiful-hunza-achieves-95-literacy/

کیا پاکستان واقعی ایک زرعی ملک ہے؟

http://data.worldbank.org/indicator/AG.LND.ARBL.ZS

http://www.finance.gov.pk/survey/chapter_10/02_Agriculture.pdf

شکوہ ظلمت شب سے کہیں بہتر تھا

https://en.wikipedia.org/wiki/List_of_countries_and_dependencies_by_number_of_police_officers

http://www.pildat.org/Publications/publication/ROLR/PoliceSystemofPakistan_PositionPaper.pdf

https://www.dawn.com/news/684973

تصاویر کے ریفرینس

غیر مستحکم علاقہ

http://nation.com.pk/columns/06-Feb-2017/utilitarianism-and-fata

https://www.thenews.com.pk/print/178303-Fata-to-get-Rs90-billion-development-budget-for-10-years-official

ہندو میرج ایکٹ

http://hindutemplespakistan.blogspot.com/

https://www.pinterest.com/pin/483362972479668804/

https://www.pinterest.com/pin/529454499921554201/

ہمارا قومی کھیل کتاب تک محدود کیوں؟

https://tribune.com.pk/story/998446/exchange-programme-pakistan-australia-agree-hockey-tours/

http://karoenjoy.pk/top-10-pakistan-hockey-players/

ہم ترقی کی جانب گامزن ہیں

http://www.roadtraffic-technology.com/contractors/project/cowi-road/cowi-road5.htm

اقلیتی برادری کے ساتھ بیتے لمحات

https://fineartamerica.com/featured/jagannath-mandir-kedar-naik.html

https://www.pinterest.com/pin/253679391484827828/

https://www.pinterest.com/aurorarea/istanbul-in-watercolor/

انفارمیشن کمیشن کو درپیش مسائل

http://www.hindustantimes.com/india/activists-to-boycott-rti-conclave-to-protest-govt-security-curbs/story-CEXfUizLnlyaNmYKhzM3XN.html

پہلا صفحہ

https://www.pinterest.com/pin/569846159074076451/

شکیبیاں

حکومت اور احتساب

نوجوانوں سے متعلق

ادارے سے آگاہی

انڈیویجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

اشاعت

میڈیا سے متعلق

تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

فردمیگزین

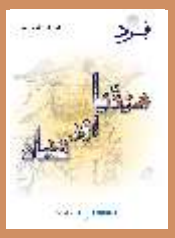

پاکستان پولیس خواتین

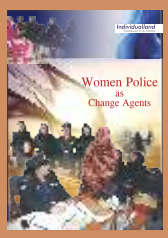

اگلی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۷ء میں

Find us
Individualland
Individualland